رسومِ اقوام

علی عباسؔ جلالپوری

فہرست

پیش لفظ

علمِ انسان کے مطالعے کے دوران میں راقم السطور کو اقوامِ عالم کی رسُوم کا جائزہ لینے کا موقع مِلا اور اِس ضمن میں چند دلچسپ انکشافات ہوئے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ رسمیں بڑی حد تک آپس میں ملتی جلتی ہیں شلاً مینہ برسانے کے ٹوٹکوں میں ہر کہیں کسی نہ کسی صورت میں زمین پر پانی گرایا جاتا ہے تاکہ بادل کو برسنے کی ترغیب ہو۔ اِسی طرح جادو کے ٹونے ایک جیسے ہیں مثلاً کسی کو جان سے مارنا ہو تو اُس کا کپڑے کا پُتلا بنا کر اُس میں سوئیاں چبھوتے ہیں یا اُس کا مٹی کا پُتلا بنا کر بہتے ہوئے پانی میں رکھ دیتے ہیں۔ اِسی طرحِ بیاہ کی رسمیں دُلہا دُلہن کو نظرِ بد یا آسیب سے بچانے کے لئے وضع کی گئی تھیں۔ مَرے ہوئے بزرگوں کی قبروں پر منتیں ماننے، حصولِ اولاد کے لئے قبروں پر اُگے ہوئے پیڑوں سے جھنڈے لٹکانے، مَرے ہوئے بزرگوں کی رُوحوں کی ضیافت کرنے کی رسمیں آج بھی اکثر ایشیائی اقوام میں دکھائی دیتی ہیں۔ رُوحوں سے رابطہ قائم کرنے کے لئے کم و بیش ملتے جلتے ٹونے کئے جاتے ہیں۔ دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ اکثر معاشرتی رسموں میں جادو، ارواح کے مت اور قدیم مذہب کے شعائر کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ زمین کی بار آوری کو تقویت دینے کے لئے تمام قدیم مُتوں میں لنگ پوجا کا رواج تھا۔ یہ روایت آج بھی ہندوستان میں باقی ہے۔ چوری کا حال معلوم کرنے، دفینوں کا سُراغ لگانے اور غیب کا احوال معلوم کرنے کے لئے کم و بیش ایک جیسے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔

سب سے آخر لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ مروّجہ رسوم زرعی معاشرے کے ابتدائی

دَور میں صورت پذیر ہوئی تھیں۔ سائنس کے فروغ سے پہلے لوگ فطری قوانین سے ناواقف تھے اور قدرتی مظاہر کی توجیہہ فکر سے نہیں تخیل سے کیا کرتے تھے۔ وہ روحوں کی پوجا کر کے اُن سے مدد مانگتے، دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے مندروں پر چڑھاوے لے آتے اور جادو کے ٹونے ٹوٹکوں سے کائنات کو مسخر کرنے اور موت اور فنا پر قابو پانے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ ایک ایسے عالم میں رہتے تھے جس پر خوف و دہشت اور اوہام و خدشات کے سائے چھائے ہوئے تھے۔ مرورِ زمانہ سے رُسوم و روایات کی گرفت انسانی ذہن پر اِس قدر مضبوط ہو گئی کہ وہ اقوام جن میں سائنس کے انکشافات کی روشنی میں معاشرے کو از سرِ نو مُرتّب نہیں کیا گیا آج بھی زرعی معاشرے کی فرسودہ رُسوم و روایات سے پیچھا نہیں چھُڑا سکیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے ہاں سائنس کو بلاشُبہ بے پناہ ترقی نصیب ہوئی ہے لیکن سائنس کا اندازِ تحقیق اُن کے مزاجِ عقلی میں نفوذ نہیں کر سکا۔ وہ جدید صنعتی معاشرے میں رہتے ہوئے بھی زرعی دَور کی رُسوم و روایات کے طلسم میں گرفتار ہیں البتّہ اُن اقوام میں جہاں سائنس کو علمی تحقیق کے ساتھ ساتھ اُس کی روشنی میں صنعتی معاشرے کو نئے سرے سے مُرتّب و مُتشکّل کر لیا گیا ہے پُرانی رسمیں مِٹ مِٹا کر رہ گئی ہیں بہرصورت جس طرح مورخینِ تمدّن کسی ملک کے عجائب گھروں میں جا کر اُس کے ماضی کی تاریخ مُرتّب کر سکتے ہیں اسی طرح قدیم رُسوم و روایات کا مطالعہ پوری نوعِ انسان کے فکری و ذہنی اِرتقاء کا جائزہ لینے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ اِس پہلو سے رُسوم و روایات کی اہمیت ہمیشہ باقی رہے گی اور اِن کا تجزیہ تقابلی مذہب، جادو، عِلم اِنسان، نفسیات اور عمرانیات کے طلبہ کے لئے سُود مند ثابت ہوتا رہے گا۔

علی عباس جلالپوری

جلال پور شریف

۲۲۔ مارچ ۱۹۸۲ء

ولادت

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ بے اولاد عورت اُس پیڑ کی مانند ہے جس کو پھل نہ لگے۔

اِس میں شک نہیں کہ عورت کی حقیقی پہچان اُسی وقت ہوتی ہے جب وہ ماں بن جائے۔ بانجھ اور بے اولاد عورت کو ہر کہیں حقارت کی نظر سے دیکھتے رہے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں تو اُس عورت کو بھی بدبخت اور منحوس سمجھتے ہیں جو اولادِ نرینہ سے محروم ہو چنانچہ عورتیں حصولِ اولاد کے لئے ولیوں کے مزاروں پر مَنتیں مانتی رہتی ہیں۔ ہندوستان کی مسلمان عورتیں شیخ سدّو یا میراں صدرالدین کے مزار واقع امروھہ میں ٹھیک دیتی ہیں جس پر انہیں حال آجاتا ہے اور وہ بے اختیار ہاتھ پاؤں چلانے لگتی ہیں۔ عورتیں اس مقصد کے لئے بزرگوں کے مزاروں پر اُگے ہوئے پیڑوں کی ٹہنیوں سے رنگ برنگ کی دھجیاں باندھتی ہیں جنہیں لنگوٹی پیر کہتے ہیں۔ ہندو مسلمان عورتیں شیخ سلیم چشتی کے مزار واقع فتحپور پر حصولِ اولاد کے لئے مَنتیں مانتی ہیں کہ جس طرح شیخ کی دُعا سے جلال الدین اکبر کے گھر سلیم پیدا ہوا تھا اِسی طرح اُن کے روحانی تصرف سے ہماری کوکھ بھی ہری ہو جائے۔ نجد میں بانجھ عورتیں ضرار بن ازور کی قبر پر اُگے ہوئے درخت سے ہمکنار ہوا کرتی تھیں۔ اِس درخت کو محمد بن عبد الوہاب نے کٹوا دیا۔ بلوچی عورتیں اولاد کی خاطر شاہ وساوا کے مزار پر اُگے ہوئے درخت سے ہمکنار ہوتی ہیں۔ بلوچستان میں بانجھ عورت کو ایک چھڑے کے نیچے سے گذارتی ہیں جو دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا ہو۔

مشرقی ممالک میں ایک عالمگیر توہم یہ ہے کہ بد رُوحوں کی پکڑ یا سایہ عورت کو بانجھ کر دیتا

ہے چنانچہ ایسی عورت کو الائچی، لونگ یا قند دم کر کے کھلاتے ہیں یا اُس کے پیڑو سے گنڈا باندھ دیتے ہیں۔ بعض علاقوں میں کسی ولی کی قبر پر تنے ہوئے شامیانے کی چوبوں سے فیتے لٹکاتی ہیں اور اولاد کے لئے منت مانتی ہیں۔ حصولِ اولاد کے لئے پیرزادوں سے بھی رجوع لاتے ہیں۔ پولیس کے کاغذات میں کئی ایسے اغوا کے واردات محفوظ ہیں کہ بعض نوجوان پیرزادے عورتوں کو بہلا پھسلا کر لے بھاگے۔ ہندو عورتیں اولاد کی خاطر کاشی جاتی ہیں جہاں بسا اوقات وہ مکار مہنتوں کے ہتھے چڑھ جاتی ہیں۔ مہنت عورت کو مندر ہی میں شب باش ہونے کی ہدایت کرتا ہے۔ اگلی صبح عورت گذشتہ شب کی تاریکی میں ہونے والا واقع کہہ سنائے تو مہنت گمبھیر لہجے میں کہتا ہے "دھنیواد! تم کتنی بھاگوان ہو، رات کو خود بھگوان چل کر تمہارے پاس آئے تھے۔" بانجھ پن کو دور کرنے کا ایک ٹوٹکا بڑا خطرناک ہے۔ بانجھ عورت کسی کے بچے کو مٹھائی وغیرہ کا لالچ دے کر اپنے گھر لے جاتی ہے اور اُسے کانسی کی چھری سے ذبح کر کے اُس کے خون میں نہاتی ہے۔ خیال یہ ہے کہ اس طرح مقتول کی روح عورت کی کوکھ میں چلی جائے گی اور اُس کے ہاں بیٹا پیدا ہوگا۔ ایسی کئی عورتیں قانون کی گرفت میں آجاتی ہیں۔

جب حمل کے آثار ظاہر ہوں تو عورت کو بہ یک وقت آسودگی اور خوف کا احساس ہوتا ہے۔ بچہ پہلوٹھی کا ہو تو دلہن کا خوف دہشت میں بدل جاتا ہے اور وہ سہیلیوں سے اکثر اپنی موت کا ذکر کرتی رہتی ہے۔ ایک خوف یہ بھی لاحق ہو جاتا ہے کہ مبادا وہ زچگی میں مر کر چڑیل بن جائے۔ کتابِ مقدس میں لکھا ہے کہ خداوند نے ممنوعہ پھل کھانے اور آدم کو بھی کھلانے پر سرزنش کرتے ہوئے حوا سے کہا تھا[1]

"میں تیرے دردِ حمل کو بہت بڑھاؤں گا۔ تو درد سے بچہ جنے گی۔"

حاملہ کو اسقاط کا اندیشہ بھی ستاتا رہتا ہے۔ ایران میں اسے اسقاط سے محفوظ رکھنے کے لئے اُس کی کمر

[1] عہد نامۂ قدیم

سے دو رنگوں کا بٹا ہوا دھاگا لپیٹ دیا جاتا ہے شرط یہ ہے کہ اسے کسی بچی نے بٹا ہو۔ جب بچی دھاگا بٹ رہی ہوتی ہے تو مُلا سورۃ یٰسین کی تلاوت کرتا رہتا ہے۔ جہاں کہیں "مبین" کا لفظ آجائے دھاگے میں گرہ ڈال دی جاتی ہے اور گرہ پر مُلا دم کرتا رہتا ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ حاملہ کے شکم میں بیٹا ہے یا بیٹی اُس کے سرہانے ایک طرف قینچی اور دوسری طرف چاقو رکھ دیتی ہیں۔ اگر سوتے میں حاملہ کا رُخ چاقو کی طرف پھر جائے تو کہتی ہیں کہ لڑکا ہوگا ورنہ لڑکی۔ بلوچوں میں سانپ کو مار کر حاملہ کو اُس پر سے گذارتے ہیں۔ پھر سانپ کو ہوا میں اُچھالتے ہیں، وہ پیٹھ کے بل گرے تو کہتی ہیں کہ لڑکا ہوگا ورنہ لڑکی۔

سُورج گرہن اور چاند گرہن کے دوران میں حاملہ اور اُس کے شوہر کو چاقو چھری سے کوئی شے کاٹنا منع ہے کیوں کہ ایسا کرنے سے بدرُوحیں جن کی گرفت میں سُورج اور چاند ہوتے ہیں جنین کو ضرر پہنچاتی ہیں اور اس کے بدن پر داغ دھبّے ڈال دیتی ہیں۔ ایک ٹُوٹکے[1] یہ ہے کہ حاملہ گرہن پر ناریل یا زیرِ زمین اُگنے والی کوئی سبزی نہیں چھو سکتی کہ اِس طرح وضعِ حمل میں مشکل پیدا ہو جانے کا احتمال ہوتا ہے۔ ہندوستان کے بعض علاقوں میں حمل کے ساتویں ماہ شوہر سر کے بال نہیں کٹواتا۔ بردھیوں میں حمل کے ساتویں ماہ کی نئی چاند رات کو سات اناج پکا کر کھلاتے ہیں جسے سُت نجّا کہا جاتا ہے۔ یہ کھانا رشتے داروں میں بٹتا ہے جو تحائف بھیجتے ہیں۔ نویں ماہ نو ماسہ کی تقریب منائی جاتی ہے اور ایک خوفناک ڈائن نونّاں چماری کی پوجا کی جاتی ہے تاکہ وہ بچے کو نہ کھا جائے۔ ایرانی عورتیں ایک عفریت آل نامی سے ڈرتی ہیں کہ وہ کوکھ میں گھس کر بچے کو جان سے مار دیتا ہے۔ ایرانی عورتیں لڑ پڑیں تو ایک دوسری کو کہتی ہیں "آلت بزند"

عربی ممالک میں زچہ کو وضعِ حمل کے وقت جس چوکی پر بٹھاتے ہیں اُسے کرسی الولادۃ

---

[1] TABOO

کہا جاتا ہے۔ نپولین سے پہلے فرانس میں رواج تھا کہ ملکہ بر سرِ عام بچہ جنتی تھی۔ وضعِ حمل کے وقت محل کے دروازے کھول دیئے جاتے اور عورتیں مرد اندر ہجوم کر آتے۔ ملکہ میری انتوانت نے اسی عالم میں سیکڑوں لوگوں کے سامنے بچے کو جنم دیا تھا۔ خیال یہ تھا کہ کسی کو یہ شک نہ ہو کہ بچہ بادشاہ کا نہیں ہے کسی دوسرے کا لا کر رکھ دیا گیا ہے۔

ایران میں وضعِ حمل میں دِقت ہو تو زچہ کی ران پر تعویذ باندھ دیتی ہیں اور ایسا پانی پلاتی ہیں جس میں کسی بزرگ کی ڈاڑھی ڈبوئی گئی ہو۔ پٹھانوں کے ہاں یہ رسم ہے کہ دایہ پانی لاتی ہے جس سے زچہ کا شوہر اپنا منہ اور پاؤں دھوتا ہے پھر یہ پانی زچہ کو پلا دیا جاتا ہے۔ اِس موقع پر ایرانی عورتیں کسی نوجوان لڑکی کا لباس پھاڑ دیتی ہیں کہ اِس طرح بچہ جننے میں آسانی ہوگی۔ ایران اور پنجاب میں وضعِ حمل کو آسان بنانے کے لئے زچہ کو تین کھجوریں کھلائی جاتی ہیں کیوں کہ روایت کے مطابق مریم عذرا نے مسیح کی پیدائش پر تین کھجوریں کھائی تھیں اور درد سے محفوظ رہی تھیں۔ پیدائش کے بعد دایہ نومولود کو عود اور شہد کی گھٹی دیتی ہے۔ پنجاب میں گھی اور شہد کی گھٹی دینے کا رواج ہے۔ اس وقت کسی اجنبی یا حائضہ کو کمرے میں آنے کی اجازت نہیں ہوتی مبادا اُس کا سایہ بچے پر پڑ جائے یسُوءِ اتفاق سے اِن میں سے کوئی اندر آجائے تو زچہ اور بچہ کو نظرِ بد سے بچانے کے لئے حرمل کی دھونی دی جاتی ہے۔ ملتان اور بہاولپور میں بچے کے سر کو گول اور خوش وضع بنانے کے لئے اُس کا سر مٹی کے گول پیالے میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات پیدائش کے وقت سر کے بجائے بچے کے پیر باہر آتے ہیں جس سے زچہ کو شدید کرب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جو بچہ اِس طرح پیدا ہو اُس کے پاؤں میں خاص قسم کی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے یعنی کسی شخص کو دردِ کمر کی شکایت ہو اور اس طریقے سے پیدا ہونے والا شخص اُس کی کمر میں لات مار دے تو دردِ کمر کو شفا ہو جاتی ہے۔

فردوسی شاہنامہ میں لکھتا ہے کہ پیدائش کے وقت رُستم غیر معمولی طور پر فربہ تھا جس سے وضعِ حمل میں بڑی دِقت پیش آئی اور اُس کی ماں درد کی شدت سے نیم جاں ہو گئی۔ آخر خدا خدا کر کے بچہ پیدا

ہوا تو اُس کی ماں نے شکر کرتے ہوئے کہا، "رُستم" یعنی میں نے رہائی پائی۔ زال نے یہی اپنے بچے کا نام رکھ دیا۔ بعض اوقات وضعِ حمل میں پیچیدگی پیدا ہو جانے سے زچہ کا پیٹ چاک کر کے بچہ نکالنا پڑتا ہے جیسے کہ جولیس سیزر پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ اس اپریشن کا نام ہی سیزرین پڑ گیا۔ شکسپیر اپنے المیہ ناٹک میکبتھ میں لکھتا ہے کہ چڑیلوں نے میکبتھ کو اس بات کا یقین دلایا تھا کہ کوئی ماں کا جنا اُسے مار نہیں سکے گا۔ جب لڑائی کے دوران میکبتھ کی مڈبھیڑ اپنے دشمن میکڈف سے ہوئی تو میکڈف نے اُسے للکارا۔ میکبتھ نے اُس کے سامنے چڑیلوں کی پیش گوئی کا ذکر کیا اور شمشیر بدست اُس پر جھپٹا۔ میکڈف لڑتے لڑتے کہنے لگا، میں ماں کا جنا نہیں ہوں۔ مجھے اُس کا پیٹ چاک کر کے نکالا گیا تھا۔ یہ کہہ کر تلوار کے ایک بھرپور وار سے میکبتھ کو مار کر شہر پناہ کے نیچے پھینک دیا۔

پیدائش کے چھٹے روز بعد چھٹی کی رسم ادا کی جاتی ہے جس میں مرد حصّہ نہیں لے سکتے۔ زچہ کو اُس پانی سے نہلاتی ہیں جسے خوشبودار جڑی بوٹیاں ڈال کر اُبالا گیا ہو۔ بچے کو ایسا کُرتا پہناتی ہیں جو کسی بڈھے کے کپڑے قطع کر کے سیا گیا ہو تاکہ بچے کی عمر طویل ہو۔ ماں ہاتھ میں قرآن پکڑے آنکھیں بند کر کے کمرے سے باہر نکلتی ہے اور آنکھیں جھپکا کر سات بار آسمان کی طرف دیکھتی ہے۔ سات سہاگنیں ست نجا سے ایک ایک لقمہ لیتی ہیں اور پھر زچہ کو کھلاتی ہیں۔ اس تقریب پر خوشی منائی جاتی ہے۔ اس رسم کی تہ میں یہ خیال ہے کہ پہلے پانچ دن بچے کی زندگی خطرے میں ہوتی ہے۔ چھٹے دن وہ چھٹی کی بلا سے نجات پا لیتا ہے۔

قدیم روما میں نومولود کو پانی سے نہیں شراب سے نہلاتے تھے۔ عیسائیوں کے ہاں بپتسمہ کا رواج ہے جس میں بچے کو زرد رنگ کے پانی میں ڈبکی دیتے ہیں۔ اس پانی پر انجیل کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں۔ مغربی ممالک میں بچے کی پیدائش کے روز ایک پودا بویا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ پودے

کی نشوونما کے ساتھ ساتھ بچہ بھی پروان چڑھتا رہتا ہے۔ جنم دن منانے کا رواج ایران سے دوسری اقوام میں پھیل گیا۔ سامیوں کے ہاں زچہ چالیس دن تک ناپاک رہتی تھی۔ ہمارے یاں چالیس تک سُوتک کے دن شمار ہوتے ہیں۔ چالیسویں روز زچہ اور بچہ کو رسمی طور پر نہلایا جاتا ہے۔ پنجابی میں اسے "چِھلا نہانا" کہتے ہیں۔ اس غسل کے بعد زچہ بچہ پوری طرح پاک ہو جاتے ہیں۔ ملایا میں چالیسویں دن بچے کو "آبا پانی" اور "دھرتی ماتا" کی زیارت کرائی جاتی ہے۔ برہمن نومولود کو باہر لے جاتے ہیں اور سورج دیوتا کے درشن کراتے ہیں۔ ایران میں مجوسی اور ہندوستان میں برہمن نومولود کی جنم پتری تاروں کے حساب سے بناتے ہیں اور اُس کے مستقبل کے بارے میں پیش قیاسی کرتے ہیں۔ زچگی کے ایام میں زچہ کی جسمانی طاقت کو بحال کرنے کے لئے خشک میوے، بادام، پستہ، گری، کھوپا، کشمش وغیرہ کوٹ کر اور گھی میں تل کر کھلاتے ہیں۔ اس خوراک کو دابڑا کہا جاتا ہے۔

امیر گھرانوں میں دُودھ پلانے کے لئے دایہ رکھی جاتی ہے جسے چھوچھا کہتے ہیں۔ مُغل بچے کے لئے کھلائی رکھتے تھے جسے انگہ کہا جاتا تھا۔ تاریخ ہند میں جلال الدین اکبر کی دایہ ماہم انگہ کا نام آتا ہے جس نے بادشاہت کے ابتدائی ایام میں درباری سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ انگہ کا بیٹا بادشاہ کا کوکلتاش یا کوکہ کہلاتا تھا۔ بیٹیوں کی رفاقت کے لئے دوسرے گھروں کی بیٹیاں رکھ لی جاتی تھیں جو بڑی ہو کر ان کی گوئیاں بن جاتی تھیں۔

عقیقہ (لغوی معنی نومولود کے سر کے بال جنہیں پنجابی میں جھنڈ کہتے ہیں) کا رواج بڑا قدیم ہے۔ قدیم مصری نومولود کے سر کے بال مونڈوا کر ان کے وزن کے برابر چاندی خیرات کیا کرتے تھے۔ یہودیوں میں عقیقہ کی تقریب دھوم دھام سے منائی جاتی تھی۔ نومولود کی پیدائش کے آٹھویں دن اُسے مسجد اقصیٰ میں لے جاتے جہاں اُس کے سر کے بال مونڈواتے تھے اور قربانی کرتے تھے۔ ہمارے ہاں عقیقہ پر بکرا

کو انعام دیتے ہیں اور برادری کی ضیافت کی جاتی ہے۔

بچے کا نام رکھنے کی تقریب بھی خوشی سے مناتے ہیں۔ ہندو اسے نام کرم کہتے ہیں اور اپنے بیٹے کے تین نام رکھتے ہیں۔ پہلا نام اکثر نفرت انگیز ہوتا ہے تاکہ بچہ نظرِ بد سے بچا رہے مثلاً دُکھی، کبڑا، بڈھا، کاگی (کوا)، دوسرا نام پنڈت جوتش کے حساب سے رکھتا ہے اور اصل نام پوشیدہ رہتا ہے اور برادری کے باہر کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔ اسلام سے پہلے کے عرب بھی بچے کو نظرِ بد سے بچانے کے لئے کراہت آمیز نام رکھا کرتے تھے مثلاً حنظلہ، حمار، کلب وغیرہ۔ یہودی اپنے بچے کا نام کسی زندہ شخص کے نام پر نہیں رکھتے مبادا وہ جلدی مرجائے۔ ہندوستان میں بچے کی عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ مختلف رسمیں ادا کی جاتی ہیں مثلاً (۱) لڈو باندھنا جب چوتھے مہینے بچہ مٹھیاں باندھنے لگتا ہے (۲) گھنگھنی کی تقریب بچے کے پہلا دانت نکالتے وقت منائی جاتی ہے (۳) رینگنے کی تقریب پر چاولوں سے بنایا ہوا مُرمُرا دوستوں، عزیزوں میں بانٹتے ہیں اور گانا بجانا ہوتا ہے (۴) ہندوؤں میں دودھ چھڑانے کی تقریب کو ان پرسن کہا جاتا ہے یعنی جب بچہ دودھ پینے کی بجائے اناج کھانے لگتا ہے (۵) بسم اللہ خوانی: جب بچہ چار سال چار ماہ اور چار دن کی عمر کو پہنچ جائے تو بسم اللہ خوانی ہوتی ہے۔ مُلّا جی کے سامنے طرح طرح کے کھانے چُن دیتے ہیں جن پر وہ فاتحہ پڑھتے ہیں اور کھا کر تن تازہ ہوتے ہیں۔ پھر وہ قلم کو صندل کے محلول میں ڈبو کر اُس سے تختی پر کلمہ لکھتے ہیں جو بچے کو چٹا دیا جاتا ہے۔ اس تقریب کے بعد بچہ مدرسے میں داخل کرا دیا جاتا ہے[1]۔

بچے کا ختنہ بعض اوقات پیدائش کے بعد ہی کرا دیا جاتا ہے۔ کبھی کبھار چار پانچ برس کی عمر تک پہنچنے پر کرایا جاتا ہے۔ ختنہ کی رسم مصریوں سے یادگار ہے۔ مصری نامختون کو گندہ سمجھ کر اُسے اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیتے تھے۔ یونانی حکماء طالیس، فیثاغورس، افلاطون، اقلیدس اور بقراط جب تحصیلِ علوم کے لئے

---

[1] قانونِ اسلام، جعفر شریف

مصر گئے تو انہیں ختنہ کرانا پڑا تھا۔ ختنہ کی یہ رسم یہودیوں کے واسطے سے تمام سامی اقوام میں بار پا گئی۔ جناب عیسیٰ ابن مریم کا ختنہ بھی کیا گیا تھا کیوں کہ وہ اصلاً یہودی تھے۔ بعد میں پال ولی نے ختنہ موقوف کر دیا تاکہ غیر یہودی بھی عیسائیت قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر نے ختنہ کو ممنوع قرار دیا۔ ہر مغل شہزادے کو تاج و تخت پانے کی آرزو ہوتی تھی اس لئے شہزادے ختنہ نہیں کراتے تھے۔ مغلوں کا ایک قانون یہ تھا کہ کوئی ساقط الاعضا ــــ جس شخص کے بدن کا کوئی عضو کٹ گیا ہو ــــ تخت پر بیٹھ نہیں سکتا تھا۔

لڑکیوں[لے] کا ختنہ کرانے کا رواج بھی قدیم مصر اور سوڈان سے لیا گیا۔ اسلام سے پہلے مکّہ کی ایک عورت اُم نمر لڑکیوں کا ختنہ کیا کرتی تھی۔ اِسے مبظّرہ ــــ بظر کاٹنے والی ــــ کہتے تھے۔

ہمارے ہاں کوئی امیر آدمی اپنے بیٹے کا ختنہ کرائے تو اس کے ساتھ دو تین غریب بچوں کا بھی ختنہ کرا دیتا ہے تاکہ اُس کا بیٹا بھی نظرِ بد سے محفوظ رہے۔ کسی غریب کا بچہ نہ ملے تو نائی بدھنے کی ٹونٹی توڑ دیتا ہے۔ مشرقی اقوام میں قدامت پسند لوگ بیٹی کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے رہے ہیں اور بیٹوں پر فخر کرتے رہے ہیں کیوں کہ وہ بڑے ہو کر قبیلے کی تقویت کا باعث ہوتے ہیں جب کہ بیٹی کو جہیز دینا پڑتا ہے اور ذلت اُٹھانا پڑتی ہے چنانچہ بیٹے کی پیدائش کو سعد اور بیٹی کی ولادت کو نحس سمجھتے ہیں۔ بیٹی پیدا ہو تو گھر میں سوگواری کا عالم دکھائی دیتا ہے، زچہ کو اشاروں کنایوں سے طعنے دیے جاتے ہیں گویا بیٹی کو جنم دے کر اُس سے کوئی جُرم سرزد ہو گیا ہے۔ بیٹے کی پیدائش پر جشن کا سماں ہوتا ہے، ہر طرف مبارک سلامت کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، ڈوم ڈھاڑی دروازے پر مبارک سلامت کے گیت گاتے ہیں، ہیجڑے ناچ ناچ کر دعائیں دیتے ہیں اور رشتہ داروں سے ویلیں بٹورتے ہیں۔ بعض مذاہب میں بھی اس تعصّب کو تقویت دی گئی ہے۔ سنسکرت میں پُتر کا لغوی معنیٰ ہے "پُت (دوزخ) سے بچانے والا" ہندو مت کی رُو سے وہی شخص سورگ (بہشت)

[لے] CLITRODECTOMY

میں جا سکتا ہے جس کی چتا کو اُس کا بیٹا آگ لگائے۔ روم میں کوئی شخص اولادِ نرینہ چھوڑے بغیر مر جاتا تو کہتے تھے کہ آخرت میں اسے عذاب دیا جائے گا۔ مجوسیوں کا عقیدہ ہے کہ جس شخص کا بیٹا نہ ہو وہ چنود کے پُل (پُلِ صراط) پر سے گذر نہیں سکے گا۔ پنجابی میں جس شخص کی اولاد نرینہ نہ ہو اُسے اوتر نکھتر کہتے ہیں اور اُسے بدبخت سمجھتے ہیں۔ لفظ اوتر عربی کا ابتر ہے جس کا معنیٰ ہے دُم کٹا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں عورتیں حمل کے آثار ظاہر ہوتے ہی اولیاء کے مزاروں اور پیروں کے سجادوں کا طواف شروع کر دیتی ہیں۔ بعض عورتیں منت مانتی ہیں کہ بیٹا ہوا تو عشرۂ محرم پر اُسے چاندی کی ہنسلی پہنائیں گی۔ بعد میں یہ ہنسلی بیچ کر غریبوں کو کھیر کھلائی جاتی ہے۔ اس مقصد کے لئے ذوالجناح پر چاندی کی چھوٹی چھوٹی چھتریاں اور پنجے چڑھانے کی منت مانی جاتی ہے۔ جس عورت کے گھر بڑی آرزوؤں کا بیٹا پیدا ہوا ہو اُسے مانگے تانگے کے کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ بسا اوقات کسی ولی کے نام پر بیٹے کے سر پر لٹ چھوڑ دی جاتی ہے۔ گویا جب تک یہ لٹ موجود ہے ولی مذکور اُس کی حفاظت کرتا رہے گا۔ جب یہ لڑکا بارہ برس کی عمر کو پہنچتا ہے تو ولی کے مزار پر اسے مونڈوانے کی تقریب برپا ہوتی ہے۔ گانا بجانا ہوتا ہے، مٹھائی بٹتی ہے۔ بعض عورتیں بیٹے کو نظرِ بد سے محفوظ رکھنے کے لئے بچپن میں اُسے لڑکی کا لباس پہناتی ہیں۔ کسی زمانے میں بیٹی سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ اُسے باپ جان سے مار دیتا تھا کہ بڑی ہو کر رسوائی کا باعث نہ بن جائے۔ اسلام سے پہلے بعض عرب قبائل میں بیٹی کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ مسلمان ہونے سے پہلے راجپوتوں اور گکھڑوں کے بعض قبیلوں میں دختر کشی کا رواج موجود تھا۔ چین قدیم میں بیٹیوں کو خشک سالی کے دوران میں لونڈیاں بنا کر ارزاں قیمت پر بردہ فروشوں کے ہاتھ بیچ دیتے تھے یا انہیں دریا میں ڈبو دیتے تھے کہ وہ اُن کا بوجھ نہ بن جائیں۔ یہ رسم پدری معاشرے میں شروع ہوئی جس میں معاشی پہلو سے بیٹے کو بیٹی پر ترجیح دی جاتی تھی اور مرد کی فوقیت عورت پر محکم ہو چکی تھی۔

بلوغت

دُنیا کی اکثر اقوام میں بلوغت کی تقریب اہتمام سے مناتے رہے ہیں۔ بلوغت کی رسوم ادا کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اب لڑکا ماں باپ کی نگرانی کا محتاج نہیں رہا اور خود مختاری کی زندگی گذارنے کے قابل ہو گیا ہے۔ لڑکے کو احتلام ہونے اور لڑکی کے ایام آنے کو بلوغت کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ افریقہ کے بعض قبائل میں ایام آنے کے کچھ روز بعد تک لڑکی کو سورج کی شعاعوں سے چھپاتے ہیں اور ایک اندھیری کوٹھڑی میں بند کر دیتے ہیں کہ کہیں سُورج اُسے حاملہ نہ کر دے۔ ہمارے ہاں حیض کو سر آنا، نہانا آنا، سر میلا ہونا، بے نمازی آنا، سر درد ہونا اور ناپاک ہونا کہتے ہیں۔ پہلے ایام آنے پر گھر کی عورتیں لڑکی کو اوڑھنی اُڑھانے کی رسم چھُپ کر ادا کرتی ہیں۔ باپ نو بالغ لڑکے پر کڑی نظر رکھتا ہے اور رات کو اپنے کمرے میں سُلاتا ہے کہ کہیں وہ جنسی بے راہ روی کا شکار نہ ہو جائے۔

نرن ناری وحشی قبیلے میں لڑکے کی بلوغت کی رسم اُس کی ڈاڑھی کے پہلے بال نوچ کر ادا کی جاتی ہے۔ لڑکا درد کا اظہار نہیں کر سکتا۔ یونان قدیم کے نوجوان اپنی ڈاڑھی کے پہلے بال دلفی کے مندر پر اپالو کو بھینٹ کیا کرتے تھے۔ روما میں جب کوئی نوجوان سترہ برس کا ہو جاتا تو اُسے بلوغت کا چغہ پہننے کی اجازت مل جاتی تھی۔ اس تقریب پر خوشی مناتے تھے۔ بلوغت کا چغہ پہنتے ہی نوجوان حُسن و عشق کی دیوی وینس کے معبد میں جا کر کسی دیوداسی سے اختلاط کرتا تھا گویا اپنی جوانی کا پہلا پھل بھینٹ کر رہا ہے۔ مشرقی افریقہ کے قبائل میں نو بالغ کے سامنے کے دو دانت توڑ دیتے ہیں۔ اگر وہ

درد کا اظہار نہ کرے تو اُسے بالغ سمجھ کر اُسے قبیلے کی ذمے داریاں سونپ دی جاتی ہیں۔ پنجاب کے دیہی علاقے پھالیہ کی تحصیل میں جب تک کوئی نوجوان چوری نہیں کر لیتا اُسے پگڑا باندھنے کی اجازت نہیں ملتی یعنی اُسے بالغ تسلیم نہیں کرتے۔

مجوسی اور برہمن آغازِ شباب پر جنیو یا گستی پہناتے ہیں۔ مجوسیوں کا گستی اوستا میں اہورا مزدا کے جو بہتّر نام ہیں اُن کی رعایت سے بہتّر دھاگوں سے بٹا جاتا ہے۔ ہندو جنیو پہنانے کی تقریب کو "اپناینا" کہتے ہیں۔ جنیو پہناتے وقت برہمن نوجوان کی عمر زیادہ سے زیادہ سولہ برس کی، چھتری کی بائیس برس کی اور ولیش کی چوبیس برس کی ہوتی ہے۔ اِس تقریب پر پنڈت لڑکے کو منتر گایتری پڑھ کر سُناتا ہے۔ اِس کے بعد لڑکے پر صبح، دوپہر اور شام کی پوجا واجب ہو جاتی ہے۔ ہندوؤں کے ہاں زندگی کے چار آشرم ہیں: پہلا برہم چاری جب لڑکا مجرّد رہ کر تعلیم حاصل کرتا ہے۔ برہم چاری کے لئے پان چبانا، پھولوں کے ہار پہننا، ماتھے پر چندن کا ٹیکا لگانا اور آئینہ دیکھنا ممنوع ہے کیوں کہ اِس سے جنسی جذبے کے بھڑک اُٹھنے کا احتمال ہوتا ہے۔

بعض اقوام میں لڑکے کے بالغ ہوتے ہی اُسے ایک نوعمر لونڈی دی جاتی تھی تاکہ وہ جنسی انحراف سے بچا رہے۔ مسلمانوں میں بھی اِس کا رواج تھا۔ جب ہارون بالغ ہوا تو اُس کے باپ مہدی نے اُسے محیاۃ نامی ایک کنیز عطا کی جس کے بطن سے ہارون کا ایک بیٹا پیدا ہوا۔ روس کے مشہور ناول نویس لیو ٹالسٹائی نے لکھا ہے کہ جب اُس کا بڑا بھائی نکولس سن بلوغت کو پہنچا تو باپ نے اُس کے پاس ایک لونڈی بھیج دی جس کے بطن سے نکولس کی اولاد بھی ہوئی۔

آج کل کے علمائے نفسیات کی طرح قدما کو بھی اِس حقیقت کا شعور تھا کہ جنسی پہلو سے آغازِ شباب کا دور بڑا نازک اور پُرخطر ہوتا ہے اور کئی نو بالغ لڑکے لڑکیاں مناسب

راہنمائی نہ ہونے کے سبب جذباتی شورش میں مُبتلا ہو کر گمراہ ہو جاتے ہیں۔ جنوبی ھند کے ماریا قبیلے والوں نے اِس مسئلے کو یوں حل کیا ہے کہ کنوارے نوخیز لڑکے لڑکیوں کے لئے ایک علاحدہ جھونپڑا بنا دیا جاتا ہے جِسے گھوٹل کہتے ہیں۔ مثلاً قبائل میں ایسے جھونپڑے کو گتورا اور بھوٹیا قبیلے میں ڈانگر داسا کا نام دیا جاتا ہے۔ رات کی تاریکی میں کنوارے نوجوان اور بن بیاھی لڑکیاں اِس جھونپڑے میں اکھٹے ہوتے ہیں۔ اِس میں شادی شُدہ عورتوں مردوں کو داخلے کی اِجازت نہیں ہوتی۔ جو لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو پسند کر لیں وہ جِنسی ملاپ کرتے ہیں۔ صُبح سویرے مُنہ اندھیرے سب اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ملاپ کرنے والوں کا ایک دوسرے سے بیاہ بھی ہو۔ بیاہ اُن کے اپنے منگیتروں ہی سے ہوتا ہے۔[ا]

[ا] RACES AND CULTURES OF INDIA, D.M. MAJUMDAR .

بیاہ

علمِ انسان کے طلبہ ہمیں بتلاتے ہیں کہ شادی بیاہ کا آغاز پدری معاشرے میں ہوا جو زرعی انقلاب کے بعد صورت پذیر ہوا تھا۔ قدیم مادری نظامِ معاشرہ میں عورت قبیلے کا محور سمجھی جاتی تھی بچے باپ کے نام سے نہیں ماں کے نام سے پہچانے جاتے تھے اور ماں ہی کے وارث ہوتے تھے۔ عملِ تولید میں عورت ہی کو کلیدی اہمیت دی جاتی تھی۔ مرد کو عورت سے جنسی تمتع کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں تھا اور وہ عورت کی خدمت کر کے ہی اس سے فیض یاب ہو سکتا تھا۔ بیٹے بیٹیاں باپ کے بجائے ماموں کو اپنا حقیقی سرپرست جانتے تھے۔ عورت اور املاک کا اشتراک تھا۔ جھونپڑوں، کھالوں اور ہتھیاروں کی طرح عورتیں اور بیٹے بیٹیاں مشترک سمجھی جاتی تھیں۔ بکارت کا تصور ناپید تھا اور باکرہ لڑکیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ آج بھی افریقہ، آسٹریلیا، جنوبی امریکہ اور جزائر بحرالکاہل کے وحشی باکرہ سے بیاہ کرنا پسند نہیں کرتے۔ جنوبی ہند کے جنگلی قبائل ٹوڈا، منڈا، گونڈ، نٹ، سانسی، موریا اور ڈوم میں کنواری لڑکیوں کے جنسی ملاپ پر کوئی قدغن نہیں ہے لیکن بیاہتا عورت کی عصمت کی کڑی نگرانی کی جاتی ہے۔

زرعی انقلاب کے بعد انسان نے شکار کی تلاش میں جنگلوں میں مارے مارے پھرنے کے بجائے دریاؤں کے کناروں پر بستیاں تعمیر کریں اور فصلیں اگانے لگے۔ زرعی انقلاب کے ساتھ پیداواری وسائل بھی بدل گئے تھے جس سے نئے پیداواری علائق اور نئی نئی اخلاق و معاشرتی قدروں نے جنم لیا۔ بکارت کا تصور پیدا ہوا جو شخصی املاک کے نئے ادارے ہی کی ایک فرع تھی۔ ہر شخص کی یہ خواہش تھی کہ اپنی ذاتی زرعی

املاک اپنے ہی صلبی فرزند کے لئے میراث میں چھوڑے چنانچہ یہیں سے باکرہ لڑکیوں سے نکاح کی ابتدا ہوئی اور کنواری لڑکیوں کی عصمت کی کڑی نگرانی کرنے لگے۔ مرد نے اراضی، گائے بیلوں اور بھیڑ بکریوں کی طرح عورت کو بھی شخصی املاک میں شامل کر لیا جیسا کہ شاہ حمورابی کے ضابطۂ قوانین سے معلوم ہوتا ہے۔ اس ضابطے میں اُن تمام کاموں کو جرائم میں شمار کیا گیا ہے جن سے کسی شخص کی ذاتی املاک پر زد پڑتی ہو۔ چنانچہ ڈاکے، چوری کی طرح اغوا اور زنا بالجبر کو بھی سنگین جرم قرار دیا گیا کیونکہ عورت بھی شخصی املاک بن کر رہ گئی تھی۔

قدیم زمانوں میں بیاہ کی اُن رسموں کا نام و نشان تک نہ تھا جو بعد میں مذہب، جادو اور نظرِ بد کی ترویج سے تشکیل پذیر ہوئیں۔ باپ اپنی بیٹیوں کو ذاتی املاک کی طرح بیچ دیتا تھا یا انہیں گائے بیلوں اور زرعی اجناس سے بدل لیتا تھا۔ یہ روایت آج بھی کہیں کہیں دکھائی دے جاتی ہے مثلاً حالیہ انقلابات سے پہلے ایران اور افغانستان میں دختر فروشی کا رواج عام تھا۔ قبائلی علاقے میں آج بھی بیٹی کی قیمت وصول کی جاتی ہے۔ یہودی بھی بیویاں خرید کرتے تھے۔ انقلاب سے پہلے چین میں قحبہ خانوں کے مالک غریب ماں باپ سے سستے داموں اُن کی بیٹیاں خرید لاتے تھے اور اُن کی کمائی کھاتے تھے۔

بیاہ کا ایک طریقہ یہ تھا کہ ایک قبیلے والے اچانک دوسرے قبیلے کی فرودگاہ پر حملہ کر کے اُن کی عورتیں اُٹھا لاتے تھے جیسے کہ قدیم زمانے کے رومی سبائن قبیلے کی لڑکیاں بھگا لاتے تھے۔ سپارٹا کی زبان میں شادی کے لئے جو لفظ تھا اُس کا لغوی معنی ہے "پکڑ لینا"۔ ہمارے ہاں بارات اسی روایت سے یادگار ہے۔ بارات میں ایک سو یا دو سو مرد شامل ہوتے ہیں۔ لڑکی کے میکے والیاں باراتیوں پر روڑے اور خشک اُپلے برساتی ہیں اور سٹھنیوں (گالیاں جو دُلہا کی عزیز عورتوں کو دی جائیں) سے اُن کی تواضع کرتی ہیں گویا وہ حملہ آوروں کا مقابلہ کر رہی ہیں۔ بیاہ کا ایک اور طریقہ یہ تھا کہ اُمیدوار کو لڑکی کے ماں باپ کی معینہ مدت تک خدمت کرنا

پڑتی تھی اور اس خدمت کے عوض لڑکی بیاہ دی جاتی تھی۔ جناب موسیٰ اپنے ماموں لابن کے پاس گئے اور اُس کی چھوٹی بیٹی راخیل کا رشتہ مانگا۔ لابن نے کہا تم سات برس تک میرے ریوڑ چراؤ تو تمہاری خواہش پوری کر دی جائے گی۔ یہ مدت ختم ہوئی تو لابن نے اپنی دوسری بیٹی لیاہ جناب موسیٰ کو بیاہ دی۔ راخیل حسین تھی جبکہ لیاہ چُندھی تھی۔ جناب موسیٰ نے کہا تم نے تو مجھے راخیل بیاہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ لابن بولا کوئی بات نہیں تم مزید سات سال میری خدمت کرو تو تم راخیل کے حق دار ہو گے۔ جناب موسیٰ نے ایسا ہی کیا اور آخر راخیل کے حصول میں کامیاب ہو گئے۔[1]

تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ بیاہ کا وہ طریقہ اختیار کیا گیا جو آج بھی اکثر مہذب اقوام میں رائج ہے یعنی لڑکی کا باپ اپنی اور لڑکی کی رضامندی سے لڑکی بیاہ دیتا ہے اور کچھ رقم لینے کے بجائے اپنے گھر سے جہیز کی صورت میں اُسے کچھ سامان دیتا ہے تاکہ دُلہا دُلہن امن اور چین سے اپنی بیاہتا زندگی کا آغاز کر سکیں۔ ہمارے معاشرے میں جہیز ایک بہت بڑی لعنت بن گیا ہے۔ اِس کی صورت میں گویا دُلہا خریدا جاتا ہے۔ غریب اور تنگ دست ماں باپ کی بیٹیاں بعض اوقات جہیز نہ ہونے کے باعث کنواری بیٹھی رہتی ہیں۔ ہندو بنگال میں کئی جوان لڑکیاں کس مپرسی سے تنگ آ کر خودکشی کر لیتی ہیں۔ لڑکی کے لئے بَر نہ ملے تو آجکل ہندوؤں میں یہ رسم چل نکلی ہے کہ کوئی لڑکا اغوا کر لیتے ہیں اور اُس کا نکاح بالجبر اپنی بیٹی سے کر دیتے ہیں۔ ہیروڈوٹس نے لیدیا کی لڑکیوں کا ذکر کیا ہے جو عصمت فروشی سے اپنا جہیز تیار کیا کرتی تھیں۔[2]

تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ محولہ بالا طریقوں کے علاوہ بیاہ کے کئی عجیب و غریب طریقے رائج تھے۔ ہیروڈوٹس نے ایک دلچسپ طریقے کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ شہر بابل میں سال میں ایک مرتبہ کنواری بالغ لڑکیاں اکٹھی کر لی جاتی تھیں۔ بیویوں کے خواہش مند اُن کے گرد حلقے میں کھڑے

[1] کتابِ مقدس [2] تاریخ

ہو جاتے پھر لڑکیوں کو یکے بعد دیگرے بولی دے کر نیلام کر دیا جاتا تھا۔ ہر خریدار نیلام میں حاصل کی ہوئی لڑکی سے نکاح کرنے کا پابند تھا۔ جو رقمیں خوبصورت لڑکیوں کے نیلام سے وصول کی جاتی تھیں اُن میں سے کم صورت لڑکیوں کے لئے جہیز تیار کئے جاتے تھے۔ سپارٹا میں رواج تھا کہ جن جوانوں اور لڑکیوں کا کہیں رشتہ طے نہ ہو سکتا انہیں برابر تعداد میں رات کو ایک اندھیرے کمرے میں بند کر دیتے تھے اور کہتے تھے اپنے اپنے لئے دُلہا یا دُلہن کا انتخاب کر لو۔ کہتے تھے کہ یہ طریقہ محبت کی شادی سے کسی طرح فروتر نہیں ہے کیوں کہ محبت کی شادی بھی تو اندھے پن کی حالت میں کی جاتی ہے۔

یہ رواج بھی قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے کہ اپنی بیٹی کا تبادلہ کسی کی بیٹی سے یا اپنی بہن کا تبادلہ کسی کی بہن سے کر لیا جائے۔ پنجاب میں اسے وٹّہ سٹّہ کی شادی کہتے ہیں۔ باپ بیٹی دے کر داماد کی بہن سے اپنا بیٹا بیاہ لیتا ہے۔ شکری آلوسی نے اسلام کے پہلے کے اعراب کے شادی بیاہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے [1]

"اعراب کے ہاں دستور تھا کہ مہر معیّن کر کے نکاح کر دیتے تھے۔ اگر لڑکی اپنے عزیزوں میں بیاہی جاتی تو رخصت کے وقت لڑکی کا باپ یا بھائی کہتا "خدا کرے تجھے بچے کی پیدائش میں آسانی ہو، تو اولادِ نرینہ جنے مادہ نہ جنے۔ خدا تیری وجہ سے تعداد بڑھائے، عزت بخشے اور گھر کو خُلد کا نمونہ بنائے۔ اپنے اخلاق اچھے رکھنا، اپنے خاوند کی عزّت کرنا اور پانی سے کستوری کا کام لینا یعنی نہاتی رہنا" .... اگر لڑکی اجنبیوں میں جاتی تو باپ یا بھائی دلہن سے کہتا "خدا کرے تجھے بچے کی پیدائش میں آسانی نہ ہو اور نہ تو اولادِ نرینہ جنے کیوں کہ اس سے تو دُور کے لوگوں کو قریب کر دے گی یا جو بچے پیدا ہوں گے وہ ہمارے

---

[1] بلوغ الارب ترجمہ پیر محمد حسن

دشمن ہونگے اپنے اخلاق اچھے رکھنا اور خاوند کے بھائیوں سے محبت سے پیش آنا۔ اُن کی نگاہیں تمہاری طرف لگی ہوں گی۔ اُن کے کان تمہاری باتوں کو غور سے سُنیں گے۔ دُعا ہے کہ پانی تمہیں کستوری کا کام دے۔"

بعض اوقات اعراب اپنی بیویاں تبدیل کر لیتے تھے۔ اسے نکاح البدل کہتے تھے۔ ایک نکاح المتعہ تھا یعنی ایک مقررہ مدت کیلئے کسی عورت سے نکاح کرنا۔ اس مدت کے گذر جانے کے بعد جدائی ہو جاتی تھی۔ اسے صیغہ یا نکاح موقت بھی کہتے تھے۔ متعہ آنحضرتؐ اور شیخ اوّل کے زمانے میں رائج تھا۔ شیخ ثانی نے اسے ممنوع قرار دیا لیکن کئی اکابر صحابہ اسے جائز سمجھتے رہے۔ مامون الرشید نے متعہ کی حلت کا اعلان کروایا تھا۔ جلال الدین اکبر نے ایک مالکی فقیہہ سے فتویٰ لے کر ایک ہی دن میں متعدد عورتوں سے متعہ کیا تھا۔ فیروز شاہ بہمنی نے متعہ کے جواز پر سنیوں اور شیعوں میں مباحثہ کرایا۔ شیعوں نے متعہ کی حلت کو ثابت کر دیا تو فیروز شاہ نے ایک ہی دن میں تین سو جوان عورتوں سے متعہ کر کے انہیں اپنے حرم میں داخل کیا۔ شاہان اودھ واجد علی شاہ وغیرہ کے محلوں میں سیکڑوں ممتوعات رہتی تھیں۔

نکاح پڑھوانے پر مذہبی پیشواؤں، پادریوں، مجوسیوں، برہمنوں اور ملاؤں کی اجارہ داری قائم ہو گئی تھی۔ پیشہ ور ربی، پنڈت، ملا وغیرہ نکاح خوانی سے ہزاروں روپے کماتے رہے ہیں۔

اپنے قبیلے سے باہر نکاح کرنے کی پابندی ٹوٹم مت کے عہد سے یادگار ہے جب ایک ہی ٹوٹم سے تعلق رکھنے والے مرد عورت آپس میں نکاح نہیں کر سکتے تھے۔ جس قبیلے کا ٹوٹم کوا ہوتا وہ کبوتر یا باز کے ٹوٹم والے قبیلے میں بیاہ کرتا تھا۔ تہذیب و تمدن کی اشاعت کے بعد بھی بعض اقوام میں یہ پابندیاں باقی رہیں مثلاً کالڈیا میں مرد اپنی ہی برادری میں نکاح نہیں کر سکتا تھا۔ دوسری طرف بعض قبائل اپنی ہی برادری میں نکاح کرنے پر مجبور تھے جیسا کہ یہودیوں اور برہمنوں میں رواج ہے۔ ہندوستان میں ذات پات کا ادارہ قائم ہوا تو مرد اپنی ہی ذات یا گوت میں شادی کرنے کا پابند ہو گیا۔ یہ پابندی آج بھی باقی و بحال ہے۔

مصرِ قدیم اور یونان میں بیوی ایک ہی ہوتی تھی۔ منوسمرتی کی رُو سے بھی پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری عورت سے نکاح کرنا ممنوع ہے البتہ راجے مہاراجے کئی کئی بیویاں رکھ سکتے ہیں۔ پہلی رانی کو بہرحال اپنی سوکنوں پر برتری حاصل ہوتی۔ اسی لئے اُسے "پٹ رانی" کہتے تھے۔ پابیوں کے ہاں ایک سے زیادہ عورتوں سے نکاح کرنا ممنوع ہے کلیسائے روم والوں کا بھی یہی شیوہ ہے۔ عیسائی ممالک میں بہ یک وقت دو منکوحات رکھنا جرم ہے۔ امریکہ کے مارمن کثرتِ ازدواج کے قائل تھے لیکن انہیں بھی ایک ہی بیوی کا پابند کر دیا گیا ہے۔ ایک سے زیادہ عورتوں سے نکاح بالعموم اُمراء کا مشغلہ رہا ہے۔ سومرہ کہا کرتے تھے کہ ایک بچہ جننے کے بعد عورت بیکار ہو جاتی ہے اس لئے مرد کو اس بات کا حق ہے کہ وہ پہلی عورت کے بچہ جننے کے بعد کسی کنواری سے نکاح کر لے۔ کئی اقوام میں ایک ہی عورت کے کئی شوہر بننے کا رواج موجود تھا۔ البیرونی[1] لکھتا ہے کہ "پیچھے ہزارہ، کافرستان، چترال، سوات ـــــ سے لے کر کشمیر کے نواح تک میں ایک عورت سب بھائیوں کی مشترکہ زوجہ سمجھی جاتی ہے۔ ایران میں مزدک نے املاک اور عورت کے اشتراک کی دعوت دی جو قدیم مادری نظامِ معاشرہ کی یاد دلاتی ہے۔ شاہ کواذ نے مزدک اور اُس کے پیروؤں کا قتلِ عام کرایا لیکن بعد کے کئی فرقوں: بابکیہ، قرامطہ اور شلمغانی کے پیروؤں نے مزدک کی طرح ہر عورت کو ہر مرد کے لئے مباح کر دیا۔ آج بھی شام کے یزیدیہ اور لبنان کے دروزیوں میں اباحتِ نسواں کے آثار موجود ہیں۔

اباّ دو لوا لکھتا ہے کہ جنوبی ہند کے نائروں میں ایک ہی عورت کے کئی شوہر ہوتے ہیں جو عام طور سے شوہر کے بھائی ہوتے ہیں۔ مشرقی میسور کے تتیار قبیلے میں چچا، ماموں، بھائی بھتیجوں میں بیویاں مشترک ہوتی ہیں۔ بنگال کے گارو قبائل میں ایک ہی عورت کے کئی شوہر ہوتے ہیں یہی حال ٹوڈا قبیلے کا ہے۔ بنگال کے سنتھال بھی ایک عورت کو سارے بھائیوں کی زوجیت میں دیتے ہیں۔ چین کے

[1] کتاب الہند۔

قبضے سے پہلے تبت میں باپ بیٹا مل کر ایک ہی عورت کو تصرف میں لاتے تھے بشرطیکہ وہ بیٹے کی اپنی ماں نہ ہوتی۔ اسلام سے پہلے اعراب بھی اپنے باپ کی موت پر اُس کی بیویاں گھروں میں ڈال لیتے تھے۔ لال ہندیوں کے کئی قبیلوں میں ہر شخص اپنی سالیوں سے تمتع کر سکتا ہے۔ غلام باسط کہتا ہے۔[1]

"ملابار میں ایک عورت کے کئی شوہر ہوتے ہیں اور وہ باری باری اُن کے ساتھ خلوت میں جاتی ہے۔"

ہیروڈوٹس اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ سکیتھیوں میں ایک بھائی کی بیوی سارے بھائیوں کی زوجہ بن جاتی تھی۔ جب ایک بھائی عورت کے ساتھ خلوت میں جاتا تو وہ دروازے پر اپنا جوتا چھوڑ جاتا تھا تاکہ کوئی دوسرا بھائی مخل نہ ہو۔ ٹاڈ کے خیال میں دروپدی کا پانڈو بھائیوں کی مشترکہ زوجہ بن جانا اسی روایت سے یادگار تھا کیونکہ راجپوت سکیتھیوں ہی کی اولاد سے ہیں۔[2] رُومی مورّخ دیو لکھتا ہے کہ شمالی برطانیہ اور سکاٹ لینڈ کے باشندے خیموں میں رہتے تھے اور اُن کے ہاں عورتیں اور بچے مشترک تھے۔ آسام میں کھاسی قبیلے میں ایک عورت کے کئی شوہر ہوتے ہیں۔ چارلس میسن لکھتا ہے۔[3]

"سکھوں کے ہاں ایک بھائی کی زوجہ دوسرے بھائیوں کے تصرف میں آجاتی ہے۔ میں جنرل ایلرڈ کے پاس ٹھہرا ہوا تھا جب مجھے بتایا گیا کہ جب کسی سکھ سپاہی کا بھائی سفر پر چلا جاتا ہے تو سپاہی چھٹی کی درخواست دیتا ہے اور وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ سفر پر جانے والے بھائی کی بیوی اکیلی رہ گئی ہے۔ جنرل ایلرڈ چھٹی کی یہ درخواست ہمیشہ منظور کر لیا کرتا تھا۔"

ہندوؤں اور سکھوں میں رواج تھا کہ کسی عورت کو تصرف میں لانا مقصود ہوتا تو اس پر چادر ڈال دیتے تھے۔

---

[1] تاریخِ ممالکِ ہند   [2] راجستھان

[3] JOURNEYS IN BALUCHISTAN, AFGHANISTAN AND THE PUNJAB.

یہ بھی ایک قسم کا نکاح تھا۔ اِس رسم کو "چادر اڈالنا" کہتے تھے۔ رنجیت سنگھ نے ایک کنچنی گل بیگم پر چادر ڈال کر اُسے اپنے زنان خانے میں داخل کر لیا تھا۔ راجہ داہر والئی سندھ نے اپنی سگی بہن پر چادر ڈال کر اُس سے نکاح کیا تھا۔ اِسلام سے پہلے کے عرب موت پر بیوہ چھوڑ جاتے تو اُن کے بڑے بیٹے اُس پر چادر ڈال کر اُسے اپنی زوجہ بنالیتے تھے۔ اِسلام کی اشاعت سے پہلے کے اعراب میں نکاح کا ایک طریقہ یہ تھا کہ ایک شخص اپنی بیوی سے کہتا کہ جب تو حیض سے پاک ہو جائے تو فلاں آدمی کو اپنے پاس بلالینا اور اُس سے ہم آغوشی کی درخواست کرنا تاکہ تجھے اُس سے حمل قرار پائے۔ اِس عرصے میں خاوند اپنی بیوی سے الگ رہتا تھا اور جب تک اُس آدمی کی توجّہ کے باعث حمل کے آثار ظاہر نہ ہوتے وہ شخص اپنی بیوی کے قریب نہیں جاتا تھا۔ ایسا کرنے کا مقصد یہ تھا کہ بچہ نجیب پیدا ہو۔ یہ درخواست شجاع اور فیاض سرداروں سے کی جاتی تھی۔[1]

قدیم زمانے کے ہندی آریاؤں میں نیوگ کا رواج تھا جس کی تفصیل دیانند نے ستیارتھ پرکاش میں دی ہے۔ کسی لاولد آدمی کی بیوی کو اِس بات کا حق پہنچتا تھا کہ وہ اولاد پیدا کرنے کے لئے کسی توانا جوان کو بُلا بھیجے۔ جب اُن کے ملاپ سے لڑکا پیدا ہو جاتا تو یہ عارضی تعلق ختم ہو جاتا تھا۔ اِسی بیٹے سے اصل خاوند کی نسل چلتی تھی۔ اِسی قسم کا رواج یونان قدیم کی ایک ریاست سپارٹا میں بھی تھا۔ عورتیں اِس بات کی مجاز تھیں کہ وہ بہادر اور تنومند جوانوں کو خلوت میں بُلا کر اُن سے اولادِ نرینہ حاصل کریں۔ شوہر خود اپنی بیویوں کو ایسا کرنے کی ترغیب دیا کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ اُن کے گھروں میں سُورمے پیدا ہوں۔

منو نے چھتریوں کو گندھرو بیاہ کی اجازت دی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی نوجوان اکیلے میں کسی کنواری لڑکی سے ملے تو بغیر بیاہ کی رسمیں ادا کئے اُس لڑکی کی رضامندی سے اُس سے جنسی تعلق قائم کرے۔ کالیداس کی ہیروئن شکنتلا اور راجکمار دشینت کا اِسی طرح کا گندھرو بیاہ ہوا تھا۔ ارتھ

[1] بلوغ الارب

شاستر میں لکھا ہے کہ کوئی شخص کسی عورت کو دشمنوں کے چنگل سے چھڑائے یا سیلاب وغیرہ کسی آفت سے بچائے تو اُسے اُس عورت کے ساتھ جنسی ملاپ کا حق مل جاتا ہے۔ مصر جدید کے دیہات میں رواج ہے کہ اگر کوئی کنواری کسی نوجوان کو خلوت میں کہہ دے وھبت لک نفسی (میں نے اپنا آپ تمہیں بخش دیا) تو وہ بغیر گواہوں اور خطبۂ نکاح کے خلوت میں جا سکتے ہیں۔ اِسے ہبتہ النفس (پنجابی میں "تن بخشائی") کہتے ہیں۔ اِس کے لئے گواہوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔

شاہیت اور جاگیرداری نظام میں بادشاہوں اور جاگیرداروں کو حق شب زفاف (شبِ عروسی کا حق) حاصل تھا۔ یعنی اُن کی رعایا میں کہیں شادی ہوتی تو دُلہن کو سہاگ رات بادشاہ یا جاگیردار کے پاس گذارنا پڑتی تھی۔ اگلی صبح اُسے سسرال بھیج دیا جاتا تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ میں پادری، جاگیردار بڑی تن دہی سے حق شب زفاف وصول کیا کرتے تھے۔ ہمایوں شاہ بہمنی جب کسی دُلہن کی پالکی کو محل کے قریب گذرتے ہوئے دیکھتا وہ دُلہن کو اپنے پاس بُلا لیتا تھا۔[1] جنوبی ہند کے نمبودری برہمن آج بھی دُلہن کو پہلی رات اپنے ہاں خلوت میں بُلا لیتے ہیں۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں۔

"ترکوں کا تورہ (قانونِ شاہی) تھا کہ جس عورت پر بادشاہ خواہش سے نظر کرے خاوند پر حرام ہو جاتی تھی۔ آج سے پندرہ یا سولہ برس پہلے میں نے خود دیکھا کہ تورۂ چنگیزی کا اثر باقی چلا آتا تھا۔ شاہانِ بخارا جس عورت پر خواہش کی نظر کرتے اُس کا وارث اُسے آراستہ کر کے حاضر کر دیتا تھا۔ پسند آئی تو حرم سرا میں داخل رہتی ورنہ رخصت ہو جاتی اور جب تک زندہ رہتی اپنی ہم چشموں میں فخر کرتی کہ مجھے یہ برکت حاصل ہوئی تھی۔"[2]

کئی اُمراء اور درباری اپنی لڑکی کے بالغ ہونے پر اُسے جلال الدین اکبر کے ملاحظے میں پیش کرتے تھے۔ بادشاہ

---

[1] فرشتہ
[2] دربارِ اکبری

کو لڑکی پسند آجاتی تو حرم میں داخل ہو جاتی ورنہ کچھ دے دلا کر اُسے واپس بھیج دیا جاتا تھا۔ مُلّا عبد القادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں لکھا ہے کہ اِس رسم کو پیش کش کہتے تھے۔ کلیان مل اپنی لڑکی پیش کش کے لئے اکبر کے پاس لایا تو اُسے حرم میں داخل کر لیا گیا۔ وتسیان لکھتا ہے کہ برار میں لوگ اپنی خوبصورت بیویاں راجہ اور منتری کے پاس لے جاتے تھے[1]۔ کئی اقوام میں محرّمات سے نکاح کرنا جائز تھا۔ شاہان ایران، بطالمہ اور فراعین مصر اپنی بہنوں اور بیٹیوں سے نکاح کر لیتے تھے۔ کلیوپیٹرا ملکۂ مصر کا نکاح اپنے بھائی سے ہوا تھا ہخامنشی بادشاہ داریوش اوّل اور کمبوجیہ نے اپنی بیٹیوں اور بھتیجیوں سے نکاح کیا تھا۔ قدیم رومہ کا ایک قانون یہ تھا کہ جب کوئی مرد اور عورت بارہ ماہ اکٹھے بسر کرتے تو وہ میاں بیوی بن جاتے تھے۔ کافرستان میں نکاح کا ایک عجیب طریقہ رائج ہے۔ کسی مرد عورت کا نکاح کرنا مقصود ہو تو اُن کے نام پر دو برابر کی چھڑیاں جکڑ کر باندھ دیتے ہیں۔ جب تک وہ بندھی رہیں وہ میاں بیوی بنے رہتے ہیں۔ اُن میں جُدائی کرنے کے لئے ان چھڑیوں کو کھول دیا جاتا ہے۔ جنوبی ہند کے مُنڈا قبیلے میں نکاح یوں ہوتا ہے کہ دُلہا دلہن کے ماتھے پر سیندور کا ٹیکا لگاتا ہے اور دُلہن دُلہا کے ماتھے پر ایسے ہی ٹیکا لگا دیتی ہے اور وہ میاں بیوی بن جاتے ہیں۔

قدیم زمانے میں رواج تھا کہ کسی مرد کی موت پر اُس کی بیوہ کو اپنے دیور سے نکاح کرنا پڑتا تھا۔ اِسی طرح کسی عورت کی موت پر اُس کا شوہر اپنی سالی سے نکاح کر لیتا تھا۔ کتابِ مُقدّس میں اِس قسم کے نکاحوں کا ذکر آیا ہے۔ اونان یہودی کا بھائی مر گیا تو اُسے اپنے بھائی کی بیوہ سے نکاح کرنا پڑا جس سے اُسے نفرت تھی۔ جنوبی ہند میں جنگلی قبائل کے ہاں مرد کے مر جانے پر عورت کو اپنے دیور سے نکاح کرنا پڑتا ہے۔ اُن کے ہاں ماموں اپنی بھانجی سے نکاح کر سکتا ہے لیکن بھتیجی سے نہیں کر سکتا۔

اشاعتِ اسلام سے پہلے عرب تین بنا پر نکاح کیا کرتے تھے (۱) مہر: جو پیارا ہو جانے

---

[1] کام شاستر

پر کیا جائے (۲) دہر: جو قبیلے کی تقویت کے لئے کیا جائے (۳) مہر: جو روپے پیسے کے لین دین پر مبنی ہو۔

یہودی مہر مقرر کر کے لڑکی کا نکاح کیا کرتے تھے۔ مہر کی رقم دلہا کو ادا کرنا پڑتی تھی اور اُس قدیم رسم سے یادگار تھی جب بیویاں خریدی جاتی تھیں۔

الفنسٹن لکھتا ہے کہ ہزارہ کے بعض علاقوں میں "کورلستان" کی رسم پائی جاتی ہے جس کی رُو سے شوہر رات کو اپنی زوجہ مہمان کے پاس خلوت میں بھیجتا ہے۔ یونانِ قدیم کی ریاست کورنتھ میں بھی یہ رسم پائی جاتی تھی اور اِسے لازمۂ میزبانی سمجھا جاتا تھا۔ ہومر نے ایلیڈ میں لکھا ہے کہ جب ٹرائے کا شہزادہ پیرس سپارٹا کے بادشاہ کا مہمان ٹھہرا تو رات کو ایک لونڈی اُس کے پاس بھیجی گئی تھی۔ کافرستان میں بھی کہیں کہیں یہ رواج موجود ہے۔

ہندو معاشرے میں بیوہ کا نکاحِ ثانی ممنوع تھا۔ یا تو وہ اپنے شوہر کی چتا پر جل مرتی تھی یا ساری عمر ذلت کے عالم میں بسر کرنے پر مجبور تھی۔ شوہر کی موت پر اُس کی بیوہ اپنی چوڑیاں توڑ دیتی۔ اُس کے سر کے بال مونڈوا دیئے جاتے تھے اور پہننے کو میلے کچیلے کپڑے دیئے جاتے تھے اور اُسے نہانے دھونے، مسی یا کاجل لگانے، خوشبو کے استعمال اور آئینہ دیکھنے سے منع کر دیا جاتا تھا۔ اکثر اوقات یہ مظلوم عورتیں کسبیاں بننے پر مجبور ہو جاتی تھیں چنانچہ رنڈی کا معنی کسبی کا بھی ہے اور بیوہ کا بھی۔ اچھوتوں میں البتہ بیوہ کے نکاحِ ثانی کا رواج موجود رہا ہے۔ ہندو معاشرے کی سب سے بڑی لعنت کمسنی کی شادی تھی منوسمرتی میں ہے

"تیس برس کا مرد بارہ سالہ لڑکی سے بیاہ کرے۔ چوبیس برس کا نوجوان آٹھ سالہ لڑکی سے بیاہ کرے"

سہاگ کی رات کو جو قیامت کمسن دلہن پر ٹوٹ پڑتی تھی اُس کی بھیانک تفصیل مس میو نے مدر انڈیا میں دی ہے۔ مس میو نے اِس کتاب میں ۱۹۲۲ء میں اسمبلی کی بحثوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ کس طرح کئی بچیاں

بیاہ کی پہلی رات ہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی تھیں یا عمر بھر کے لئے اپاہج اور اولاد پیدا کرنے کے ناقابل ہو جاتی تھیں۔ ایک بچی کو بیاہ کی دوسری رات خون میں لت پت ہسپتال میں داخل کرایا گیا اور وہ کئی روز تک جانکنی کی حالت میں ہاتھ پاؤں مارتی رہی۔ مس میو نے ہسپتالوں کے ریکارڈ سے ایسی کئی خوفناک مثالیں دی ہیں۔ مدر انڈیا کی اشاعت پر دنیا بھر میں کہرام مچ گیا۔ گاندھی جی نے مس میو پر بہت کچھ کیچڑ اچھالا لیکن ہندوؤں کو بالآخر شاردا ایکٹ ۱۹۳۰ء میں نافذ کرنا پڑا جو کمسنی کی شادی کو روکنے کے لئے پیش کیا گیا تھا۔

جلال الدین اکبر نے شادی کے بارے میں قوانین بنائے تھے جن میں کمسنی کی شادی کو روکنے کی ناکام کوشش کی تھی۔[1]

"بے اطلاع کوئی شادی نہ ہوا کرے۔ عوام الناس کی شادی ہو تو دلہا دلہن کو کوتوالی میں دکھا دو۔ عورت مرد سے بارہ برس بڑی ہو تو مرد اس سے تعلق نہ کرے کہ باعث ضعف و ناتوانی ہے۔ لڑکا سولہ برس اور لڑکی چودہ برس سے پہلے نہ بیاہی جائے۔ چچا اور ماموں وغیرہ کی لڑکی سے شادی نہ کرو کہ رغبت کم ہوتی ہے۔ اولاد ضعیف ہوگی۔"

مرورِ زمانہ سے بیاہ کی مذہبی رسوم کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ جنوں، بھوتوں، جادو اور نظرِ بد کے اثرات سے بچنے کے لئے نئی نئی رسمیں وضع کی گئیں جو ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں آج بھی باقی ہیں۔ برصغیر ہند و پاک میں ہر کہیں ان کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ ان رسموں کا تعلق زرعی معاشرے سے تھا۔ صنعتی معاشرے میں پرانی رسمیں دم توڑ چکی ہیں۔ علم الانسان کے پہلو سے اشد ضروری ہے کہ ان روز بروز مٹتی ہوئی رسموں کو محفوظ کر لیا جائے۔ ہم اپنے سماج کے حوالے سے بیاہ کی مروّجہ رسموں کا ذکر قدرے تفصیل سے کریں گے۔

جب بیٹا بیٹی جوان ہو جائیں تو ماں باپ موزوں رشتے کی ٹوہ میں لگ جاتے ہیں۔ اپنی برادری میں کسی لڑکی پر نظرِ انتخاب رکھی ہو تو اس لڑکی کو "تک" کہتے ہیں۔ باہر سے بہو لانے کا خیال ہو تو یہ کلم

---

[1] دربارِ اکبری ۔ محمد حسین آزاد

نائی اور نائن کے سپرد کیا جاتا ہے۔ عرب ممالک میں رشتہ کرانے والی عورت کو خطیبہ کہتے ہیں۔ ہندوؤں کے ہاں لڑکی والے لڑکے والوں کے ہاں نائی کے ہاتھ پیغام بھجواتے ہیں۔ فریقین کی عزیز عورتیں کسی نہ کسی بہانے ایک دوسرے کے گھر جا کر لڑکی یا لڑکے کو دیکھنے کے علاوہ اُن کی حیثیت اور شہرت کے بارے میں معلومات حاصل کرتی ہیں۔ فریقین رضا مند ہوں تو منگنی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ اڑیسہ اور بہار کے خانہ بدوشوں میں منگنی کی رسم خاصی دلچسپ ہے۔ لڑکے کا باپ لڑکی کے باپ سے مل کر کہتا ہے "میں نے سُنا ہے کہ تمہارے باغ میں ایک پھول کھلا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے توڑ کر اپنے بالوں میں سجالوں"۔ لڑکی کا باپ مان جائے تو بات پکی ہو جاتی ہے۔ منگنی کو شکر خوری، نسبت، شربت نوشی اور ہری بیل بھی کہا جاتا ہے۔ سندھ میں منگنی کو پوچھی اور ایران و افغانستان میں نام زدگی کہتے ہیں۔ منگنی کی خواہش کے اظہار کے لئے دوآبہ گنگ و جمن کے مسلمانوں میں لڑکے والے لڑکی کے لئے مٹھائی، چوڑیاں، مہندی اور ایک ریشمیں جوڑا بھیجتے ہیں۔ اسے شکرانہ کہتے ہیں۔ رشتہ منظور ہو تو لڑکے والوں کی طرف سے بھیجا ہوا قول بیڑا (عہد کا پان) رکھ لیا جاتا ہے ورنہ لوٹا دیتے ہیں۔ منگنی کی تاریخ مقرر ہو جائے تو لڑکے کی ماں، بہن ایک جوڑا کپڑے، ہار سنگھار کا سامان، مٹھائی اور پھل کے خوان اور چھوٹا موٹا سونے کا زیور لے کر لڑکی والوں کے گھر جاتی ہیں جہاں لڑکی والوں کی برادری اکٹھی ہوتی ہے اور ضیافت کا سامان کیا جاتا ہے۔ لڑکی کا باپ اپنی برادری کے معزز افراد کے سامنے برملا کہتا ہے کہ میں نے اپنی فلاں بیٹی کا رشتہ فلاں کے بیٹے سے منظور کر لیا ہے۔ اس کے بعد دُعائے خیر مانگتے ہیں اور حاضرین کو شکر یا مٹھائی کھلائی جاتی ہے۔ لڑکے والیاں منسوبہ کو اپنے گھر سے لایا ہوا جوڑا پہناتی ہیں۔ منگنی کے بعد لڑکی والے اپنی برادری کے چند سرکردہ افراد کی معیت میں لڑکے والے کے گھر جاتے ہیں جہاں اُن کی خاطر مدارت اور آؤ بھگت کی جاتی ہے۔ اس رسم کو پنجاب میں "دھرو یڈا" کہتے ہیں۔ منگنی اور بیاہ کے درمیانی وقفے میں عید آجائے تو لڑکے والے لڑکی کے لئے ایک بڑھیا جوڑا، مٹھائی، مہندی اور چوڑیاں بھیجتے ہیں۔ بعض ممالک

میں نامزد بازی یعنی منسوبہ سے چوری چھپے جنسی تعلق قائم کر لینے کا رواج تھا۔ یونان قدیم کی ریاست سپارٹا میں نوجوان فوجی تربیت کے لئے بارکوں میں رہتے تھے۔ جب کسی نوجوان کی منگنی ہو جاتی تو وہ رات کے اندھیرے میں اپنی منسوبہ سے ملنے چلا جاتا تھا۔ لڑکی کے والدین اِسے معیوب نہیں جانتے تھے۔ ایران، سندھ، افغانستان اور قبائلی علاقے میں بھی نامزد بازی کا رواج تھا۔ بعض اوقات شادی پر لڑکی کی پالکی کے ساتھ اُس کے بچے کا پالنا بھی ہوتا تھا۔ سندھ کے مہانے (ملاح) آج بھی اپنی منگیتر کے ساتھ خلوت میں جانا اپنا حق سمجھتے ہیں۔

شادی سے پہلے تاریخ مقرّر کرنے کی تقریب برپا ہوتی ہے۔ لڑکے کا باپ اپنے چند عزیزوں کے ہمراہ اِس مقصد کے لئے لڑکی والوں کے گھر جاتا ہے۔ لڑکی والوں کی برادری بھی آجاتی ہے اور باہمی مشورے سے شادی کی تاریخ معیّن ہو جاتی ہے۔ اِس تقریب پر بڑی خوشی منائی جاتی ہے۔ لڑکی والے گھر کی عورتیں لڑکے کے باپ اور اُس کے ساتھیوں پر سُرخ، زرد اور سبز رنگ پانی میں گھول کر پھینکتی ہیں۔ اِسی روز سے شادی والے گھروں میں ڈھولک رکھی جاتی ہے اور لڑکیاں رات گئے تک گاتی بجاتی ہیں۔ بعض علاقوں میں بیاہ کی تاریخ مقرّر ہونے پر لڑکے والے لڑکی کے لئے سالُو (گوٹا لگا ہوا سُرخ دوپٹہ)، مہندی، بتاشوں اور چھوہاروں کی چنگیریں اور ایک سَو روپیہ نقد بھیجتے ہیں۔

بیاہ کے دن تک محلے بھر کی لڑکیاں ڈھولک کی تھاپ پر پیار اور بیاہ کے لوک گیت ماہیا، بارہ ماسہ، سوہلے وغیرہ گاتی رہتی ہیں۔ میراسنوں اور مُصلّنوں کی سُریلی آوازیں سماں باندھ دیتی ہیں۔ گانا ختم ہونے پر گُڑ بٹتا ہے۔ نائی گنڈھ (گرہ) لے کر عزیزوں اور رشتہ داروں کو مدعو کرنے چلا جاتا ہے۔ نائی اکثر اَن پڑھ ہوتا ہے اِس لئے یاد رکھنے کے لئے جتنے آدمیوں کو دعوت پر بلانا ہو اُتنی ہی گرہیں دگنڈھا ایک دھاگے میں لگا کر اُسے اپنے پاس رکھ لیتا ہے۔ جب کسی کے گھر جا کر دعوت دیتا ہے ایک گرہ کھول دیتا ہے۔ سب لوگ اُسے کچھ نہ کچھ رقم دیتے ہیں۔ بیاہ کے ایک دو روز پہلے رشتے دار بیاہ والے گھر پہنچ جاتے ہیں۔

اس اکٹھ کو "میل" کہتے ہیں یعنی رشتے داروں کی میل ملاقات۔ میل آنے سے بیاہ کے گھر میں خوب چہل پہل اور گھما گہمی ہو جاتی ہے اور چاروں طرف گانے بجانے اور ہنسی چہل کی آوازیں آتی ہیں۔ میلی اپنے ساتھ تحائف اور ورتن بھانجی کے جوڑے لاتے ہیں۔ ورتن بھانجی ہمارے دیہات کا ایک قدیم ادارہ ہے اور دیہی معاشرے کا مرکز و محور ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کسی کو بیاہ والے گھر سے کبھی کسی تقریب پر بیور ــــ دو کپڑوں کا جوڑا ــــ یا زیور ــــ تین کپڑوں کا جوڑا ملا ہو وہ ویسے ہی جوڑے بیاہ والے گھر لاتا ہے۔ ورتن بھانجی کا افادی پہلو یہ ہے کہ اس طرح ماضی میں برادری کو دیئے ہوئے جوڑے واپس آجاتے ہیں جن سے لڑکے کی بری اور لڑکی کا جہیز آسانی سے بن جاتا ہے۔ جوڑوں کے ساتھ نقدی یا زیور دینا بھی ورتن بھانجی میں شامل ہے۔

دوآبہ گنگ وجمن کے مسلمان گھرانوں میں بیاہ کی تقریب سے پہلے لڑکے لڑکی والے ایک دوسرے کے گھر ساچق (ترکی کا لفظ بمعنی تحائف) بھیجتے ہیں۔ یہ رسم تاتاریوں کے ساتھ ہندوستان میں آئی۔ اس روز سے لڑکی لڑکے کو دلہا دلہن کہنے لگتے ہیں۔ دوسرے دن حنابندی کی رسم ہوتی ہے اور لڑکے لڑکی کو مانجھے بٹھا دیا جاتا ہے۔ مانجھے کا لغوی معنیٰ ہے صاف کرنا۔ اس کے دوران میں لڑکی کے بدن پر خوشبودار اُبٹنے ملتی ہیں اور معمولی کپڑے پہناتی ہیں تاکہ اُسے نظرِ بد نہ لگ جائے۔ مہندی جنوں بھوتوں کو بھگانے کے لئے لگائی جاتی ہے۔ حنابندی کی رسم کم و بیش تمام اسلامی ملکوں میں موجود ہے۔ مصر میں مہندی لگانے کی رات کو لیلۃ الحنا کہتے ہیں۔ دلہن سمیت تمام عورتیں ہاتھوں میں مہندی لگاتی ہیں اور اس سے بڑے خوبصورت نقش و نگار کرتی ہیں۔ دلہن کی مہندی لگے ہاتھوں پر رشتے دار عورتیں اپنی اپنی حیثیت کے مطابق رقم رکھتی ہیں۔ مہندی کی رات کو دلہن کے بالوں کی مینڈھیاں کھول کر سہاگنیں بالوں میں تیل چوآتی ہیں اور ساتھ ساتھ شگن کے گیت گاتی ہیں۔

پنجابی دیہات میں گھڑولی (پانی کی گھڑی) بھرنے کی رسم بڑی دلچسپ ہے۔ گھڑولی کے گرد

رنگ برنگ کے دھاگوں سے بٹی ہوئی مَولی لپیٹ دیتی ہیں۔ ایک عورت گھڑولی سر پر رکھ لیتی ہے اور سُہاگنیں سوہلے گاتی ہوئی جلوس کی شکل میں گاؤں کے باہر کسی کنوئیں سے پانی بھرنے کے لئے جاتی ہیں۔ اُن کے ساتھ بھرائی گھڑولی کی خاص تال میں ڈھول پیٹتے ہوئے جاتے ہیں[1]۔ جنوبی ہند کے مُنڈا قبائل میں بھی یہ رسم موجود ہے۔ اُن کے ہاں دُلہا دُلہن کو اُس پانی سے نہلایا جاتا ہے جو پانچ کنواریاں گھڑوں میں بھر کے لاتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ گھڑولی بھرنے کی رسم قدیم دراوڑوں کے ہاں رائج تھی اور آج بھی پنجاب اور جنوبی ہند کے دراوڑی قبائل میں موجود ہے جو آریا حملہ آوروں کے آگے بھاگتے ہوئے دکن کو چلے گئے تھے۔ گھڑولی کے پانی سے دُلہا کو سِرکی کی تیلیوں کے کھارے پر بٹھا کر نہلاتے ہیں۔ "کھارے چڑھنا" کا محاورہ پنجابی دیہات میں بیاہ کے لئے آتا ہے۔ جب دُلہا نہا کر کھارے سے نیچے اُترتا ہے تو اسے نیچے رکھی ہوئی مٹی کی چھوٹی ٹھوٹھیاں توڑنا پڑتی ہیں۔ اِس تقریب پر دُلہا کا ماموں اُسے "کھارا لہائی" کی صورت رقم یا جنس دیتا ہے۔ دُلہا کے ہاتھ میں لوہے کی چھڑی — کھونڈی — تھما دی جاتی ہے جو جنوں بھوتوں کو بھگانے کے لئے بیاہ کے دوران میں اُس کے ہاتھوں میں رہتی ہے۔ نائن دُلہن کی مینڈھیاں کھول دیتی ہے جو کنوارپنے کی علامت ہیں اور اُسے نہلاتی ہے۔ مصر میں عورتیں دُلہن کو حمام میں لے جاتی ہیں جہاں بلانہ (حمام کی ملازمہ) اُسے نہلا کر اُس کا سنگھار کرتی ہے اور نورہ (بال صفا) لگاتی ہے۔ ہمارے ہاں اِن تقاریب پر کمین اپنے اپنے لاگ[2] وصول کرتے ہیں۔ اِن میں نائی اور نائن کے لاگ سب سے زیادہ ہوتے ہیں۔ بیاہ والے گھر میں نائن کی چودھراہٹ ہوتی ہے۔ تمام کمین عورتیں اُس کے اشاروں پر دوڑتی پھرتی ہیں۔ کسی کی چودھراہٹ پر طنز کرنا ہو تو پنجابی میں کہتے ہیں "اینج پئی پھردی اے جویں ویاہ آلے گھر نین"۔

میراسی دُلہا کی کلائی پر گانا باندھتا ہے جو سُرخ، سبز، زرد، سیاہ اور سفید رنگ کے

---

[1] دو پتر ہرنولی دے۔ کھُل گئی مینڈھی وج گئے ڈھول گھڑولی دے۔ [2] حق خدمت

ریشمیں دھاگوں سے بٹا ہوا کنگن ہوتا ہے جس کے ساتھ نظرِ بد اور آسیب سے بچاؤ کے لئے لوہے کا چھلا، پھندنا اور حرمل کی پوٹلی بندھی ہوتی ہے۔ دلہن کو گانا اور مولی نائن پہناتی ہے۔ مولی سوتی رنگین دھاگوں سے بٹا ہوا لچھا ہوتا ہے۔ نائی اور نائن کٹوروں میں دہی یا چھاچھ ڈال کر مہمانوں کے سامنے لے جاتے ہیں اور ان سے لاگ لیتے ہیں۔ اس دوران میں وقفے وقفے سے شادی والے گھر کے دروازے پر یا چھت پر ڈھول پٹتے رہتے ہیں اور شہنائیاں بجتی رہتی ہیں۔ لڑکے کے عزیز باری باری ڈھول باجے والوں کو ایک ایک روپے کی ویل دیتے رہتے ہیں۔ ڈھول باجے والے ویل ملنے پر ان کے نام اور رقم کا اعلان دعائیہ کلمات کے ساتھ کرتے جاتے ہیں۔ مصر میں آلاتی اپنے ساز بجاتے ہیں۔ عالمہ (گیت گانے والی) گاتی رہتی ہے اور غازیہ (جمع غوازی) تھرک تھرک کر دف کی تال پر ناچتی ہیں۔ شادی سے ایک دن پہلے کی رات کو دلہا اپنے ساجھلوں (شہ بالوں) اور لڑکی اپنی ساجھلیوں کے جھرمٹ میں گاؤں کے گلی کوچوں کا چکر لگاتی ہے جسے ایران میں شب گشت کہا جاتا ہے۔ لڑکیاں گا گا کر اور ناچ ناچ کر خوب دھما چوکڑی مچاتی ہیں۔ دلہن آخری رات گویا اپنے میکے کی گلیوں سے رخصت ہوتی ہے۔

بارات کے روانہ ہونے سے پہلے لڑکے والے کھانا پکوا کر برادری کے گھروں میں بھیجتے ہیں۔ اسے ورڑ یا سنبھال کہا جاتا ہے۔ دلہا اور دلہن کے سروں کے گرد گھما کر کچھ روپیہ غریب کمین عورتوں کو دیا جاتا ہے۔ اسے سروارنا یا سرصدقہ کہتے ہیں۔ اودھ میں برنجی انگیٹھی میں دہکتے ہوئے کوئلوں پر حرمل پھینک کر دلہا دلہن کے سروں کے گرد گھماتے ہیں تاکہ وہ سایہ سے بچے رہیں۔ دلہا کو نظرِ بد سے بچانے کے لئے سہرا باندھ کر اس کا چہرہ ڈھک دیا جاتا ہے اور پھر اس کے سراپا پر مقنع (کیسری یا ریشمیں چادر) اڑھا دی جاتی ہے۔ شہری اس کے گلے میں سو سو کے نوٹوں کے ہار ڈالتے ہیں۔ دلہا گھوڑی پر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کا ساجھلا یا سرباجھلا (شہ بالا) اس کے پیچھے بیٹھ جاتا ہے۔ اس موقع پر عورتیں لہک لہک کر گھوڑیاں یا خوشی کے گیت گاتی

ہیں ان میں دُلہا کی بہن کی آواز نمایاں ہوتی ہے "گھوڑی چڑھیا، گھوڑی چڑھیا، ویرمیرا گھوڑی چڑھیا" گاتے ہوئے بہن آگے بڑھتی ہے اور گھوڑی کی باگ تھام لیتی ہے۔ دُلہا بھائی کو "واگ پھڑائی" کی خاصی رقم بہن کو دینا پڑتی ہے جب کہیں وہ باگ چھوڑتی ہے۔ بارات باجوں گاجوں اور ڈھولوں کی کڑم دھم میں شام کے جھٹپٹے میں دُلہن کے گھر پہنچتی ہے ـــــ آج کل شہروں میں باراتیوں کو کوکا کولا یا چائے کی پیالی پیش کی جاتی ہے ـــــ دیہات میں لڑکیاں مکانوں کی منڈیروں پر خشک اُپلے لے کر بیٹھ جاتی ہیں اور باراتی قریب آئیں تو اُن کو نشانہ بناتی ہیں اس طرح گویا حملہ آور باراتیوں کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ پہاڑی علاقوں میں بارات کے قریب آنے پر ایک بھاری پتھر راستے میں رکھ دیا جاتا ہے اور للکارا جاتا ہے "کون ہَی کا جنا اُٹھائے گا یہ پتھر؟" یہ سن کر باراتیوں میں سے کوئی شہ زور جوان آگے بڑھتا ہے اور ایک ہی جھٹکے سے پتھر اُٹھا کر پرے پھینک دیتا ہے۔ اِس پر سب واہ واہ کہہ اُٹھتے ہیں اور بارات کو آگے بڑھنے کی اجازت مل جاتی ہے۔

لڑکی کا باپ اور اُس کے رشتے دار آگے بڑھ کر بڑے تپاک سے باراتیوں سے گلے ملتے ہیں۔ باراتیوں کو ایک سجے سجائے کمرے میں بٹھایا جاتا ہے دودھ یا چائے اور مٹھائی سے اُن کی تواضع کی جاتی ہے۔ میراسی چھوہارے چھتے اُن کے آگے رکھتے ہیں۔ بارات کے ساتھ آنے والی عورتیں بری کے صندوق اور مٹھائی کے خوان اُٹھوا کر زنان خانے میں جاتی ہیں۔ ساتھ بَد کی گٹھڑی بھی کسی کمین عورت نے اُٹھائی ہوتی ہے۔ بَد میں چھوہارے، ساؤگی، بادام، اخروٹ، ناریل وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔ لڑکی والیاں اِس کا وزن کر کے آدھی بَد لوٹا دیتی ہیں۔ لڑکی کی برادری کی عورتیں بڑے غور سے بری کے جوڑے، زیور، آرائش کا سامان دیکھتی ہیں۔ زیور خواہ کتنے بھاری ہوں اور جوڑے خواہ کتنے ہی قیمتی ہوں وہ بے رحمی سے آوازے کستی ہیں۔ کوئی کہتی ہے "ہائیں یہ تو کچھ بھی نہیں لائے" دوسری بولتی ہے "کنگلوں کو لڑکی دے کر اُس کی قسمت پھوڑ دی" ایک آواز سُنائی دیتی ہے "گہنے پیتل کے بنے ہوئے دکھائی دیتے ہیں"۔ لڑکے والیاں چپ چاپ بیٹھی سُنتی رہتی ہیں اور

اُف نہیں کرتیں بس کھسیانی ہوکر مسکرائے جاتی ہیں۔

مردانے میں نکاح کا جلسہ برپا ہوتا ہے۔ دُلہن کا کوئی بزرگ اندر جاکر لڑکی کی رضامندی لے کر مُلاّجی کو بتلاتا ہے۔ دُلہن کنواری ہو تو اُس کی خاموشی کو رضا تسلیم کر لیا جاتا ہے، مُطلّقہ یا بیوہ ہو تو اُسے کھل کر کہنا پڑتا ہے "میں راضی ہوں"۔ دُلہا تین بار مُلاّجی کا کہا ہوا عقدِ نکاح یا صیغۂ نکاح دُہراتا ہے۔ خطبۂ نکاح کے ختم ہوتے ہی چاروں طرف سے مبارک سلامت کی آوازیں آتی ہیں اور چھوہارے لُٹائے جاتے ہیں۔ آج کل نکاح نامے پر لڑکی کے دستخط لئے جاتے ہیں اور مہر یا دوسری شرائط لکھ دی جاتی ہیں۔

میراسی ڈھڈھ اور بھانڈ لیترے لئے آجاتے ہیں۔ خُوب گانا بجانا ہوتا ہے۔ بھانڈوں کی نقلوں پر قہقہے لگائے جاتے ہیں۔ آج کل قوّال اپنے ساتھی لے کر آجاتے ہیں اور قوالی شروع ہو جاتی ہے۔ پھر زنان خانے سے پیغام آتا ہے کہ دُلہا کو اندر بھیجیں۔ دُلہا میاں کی آزمائش کڑی ہوتی ہے۔ چاروں طرف سے عورتیں اُسے گھیر لیتی ہیں اور باری باری اُس کی ناک، رنگ، آنکھوں پر پھبتیاں کستی ہیں۔ دُلہا دُبلا ہو تو ناک سکوڑ سکوڑ کر اُس کی ماں سے کہتی ہیں "اے بی! کیسا گُدّا سا ہے۔ ماں نے جی بھر کر اسے دودھ نہیں پلایا" کسی میراثن کی آواز آتی ہے "یہ تو تھن ترٹ ہے یعنی ماں نے قبل از وقت اس کا دودھ چھڑا دیا تھا اس لئے سوکھا سہارہ گیا ہے"۔

رُسومِ ہند میں پیارے لال آشوب نے اس منظر کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا ہے

"پھر دُولہا کا کنگن دُلہن سے اور دلہن کا کنگن دُلہا سے کھُلوایا۔ جب کروڑی مل سے کنگنی کا کنگن نہ کھُلا تو عورتوں نے چاروں طرف سے خوب قہقہے لگائے اور آوازے کسے۔ کوئی کہنے لگی "ارے بھلی لٹیا ڈبوئی، ماں نے تجھے خوب دودھ پلایا ہے" کوئی کہنے لگی "ارے بھلی ڈبوئی جو یہی گرہ نہیں کھول سکتا تو آگے کو کیا کرے گا۔"

پھر دُلہا سے عملی مذاق کئے جاتے ہیں۔ ایک سالی دودھ میں نمک مرچ مِلا کر لے آتی ہے۔ وہ آفت رسیدہ ایک گھونٹ بھرتا ہے تو کھانستے کھانستے بے حال ہو جاتا ہے جس پر عورتیں کھِلکھِلا کر ہنستی ہیں۔ ایک سالی اُس کے سر کے گرد جھُنجھنا گھُماتی ہے اور کہتی ہے پکڑو اِسے۔ دُلہا پکڑ نہیں پاتا تو اُسے مذاق کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ایران میں دلہن کی سہیلیاں بکری یا بھیڑ کی مینگنیاں جو شکر میں غلاف کی گئی ہوں دُلہا کو کھِلاتی ہیں جب وہ کراہت سے مُنہ بنا کر انہیں تھوک دیتا ہے تو قہقہوں کا شور بلند ہوتا ہے۔ اِسے نقل پیش کِل کہتے ہیں۔

سالیاں لاگوں کے نام پر دُلہا سے خاصی رقمیں بٹور لیتی ہیں۔ بعض روپے لینے کے لئے جھُوٹ موٹ کی سالیاں بن بیٹھتی ہیں۔ ہمارے ہاں "بیڑو گھوڑی" کی رسم بڑی دلچسپ ہے۔ ایک چوکی پر گیلے آٹے کی بنائی ہوئی کچھ مُورتیاں رکھ دی جاتی ہیں۔ اِن میں سے ایک کو دُلہا کی ماں کہا جاتا ہے، دوسری کو اُس کی بہن، چچی یا نانی دادی کا نام دیا جاتا ہے۔ پھر سالیاں کہتی ہیں "توڑو انہیں" جب دُلہا انہیں توڑ دیتا ہے تو لڑکیاں خوشی سے تالیاں پیٹتی ہیں اور کہتی ہیں "تم نے اپنے ہاتھ سے ماں بہنوں کی مُورتیاں توڑی ہیں۔ آج سے تم صرف اپنی دُلہن کا حکم مانو گے اور ماں بہن کی کوئی بات نہیں سُنو گے"۔ ایک سالی "پیر پوکھڑا" تیار کرتی ہے۔ دُلہا کے پاؤں کے انگوٹھے سے رسّی باندھ دی جاتی ہے اور جب تک وہ موٹی رقم نہیں دیتا رسّی کھولی نہیں جاتی۔ پچھلے دِنوں ایک دُلہا سے سالیوں نے ایک ہزار روپیہ مانگا۔ اُس نے دینے سے انکار کر دیا تو سالیاں اُس پر پل پڑیں۔ ناخنوں کے کھرونچوں سے اُس کے ہاتھ لہو لہان کر دیئے۔ اُس کا سہرا کھینچ لیا اور اُس کے پیر میں رسّہ ڈال کر پلنگ کے پائے کے ساتھ جکڑ کر باندھ دیا۔ آخر بیچارے نے مطلوبہ رقم دے کر اپنی جان چھڑائی۔ اس موقع پر رشتے دار عورتیں دُلہا کو سلامی کی رقمیں دیتی ہیں جو ورتن بھاجی کے طریقے پر دی جاتی ہیں۔ پھر دُلہا کو لڑکی والوں کا جوڑا پہنایا جاتا ہے اور اُس کی کیسری اُتار کر دُلہن کو اُڑھا دی جاتی ہے گویا آج سے وہ ایک دوسرے کا لباس بن گئے ہیں۔ دُلہا دُلہن کے اُتارے ہوئے جوڑے نائی اور

نائن کو ملتے ہیں۔ دُلہن کی ماں اپنے داماد سے دودھ پلائی کی رقم وصول کرتی ہے یعنی اُس دودھ کی قیمت جو اُس نے اپنی بیٹی کو پلایا تھا۔ ایران، بلوچستان اور افغانستان میں اس رقم کو شیر بہا (دودھ کی قیمت) کہتے ہیں۔

دوسری صبح کو ڈولی نکالنے کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ باراتیوں کو پُرتکلّف ناشتہ کرایا جاتا ہے۔ دُلہن کا جہیز جسے دیہات میں داج، دت، دات یا دھیج کہتے ہیں صحن میں چارپائیوں پر پھیلا کر رکھ دیا جاتا ہے تاکہ سب لوگ ایک ایک چیز اچھی طرح سے دیکھ لیں۔ جہیز میں پورے گھر کا سامان ہوتا ہے۔ پلنگ، لبستر، بھینس گائے بھینس سے لیکر مدھانی، چرخا، دیلچی تک ہر شے موجود ہوتی ہے۔ باراتی ان چیزوں کو دیکھ دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ میراسی "داج ہوکنے"[1] آجاتا ہے۔ اِسے کھٹ (کھاٹ) بھی کہتے ہیں۔ وہ بلند آواز میں گانے کے لہجے میں جہیز کی ایک ایک چیز کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے اور داد کے ساتھ لاگ بھی وصول کرتا ہے۔ اس کے بعد جہیز کی چیزوں کو سمیٹا جاتا ہے کمین صندوق اور گٹھڑیاں سروں پر اُٹھا لیتے ہیں۔ باجوں گاجوں کے شور میں دُلہن روتی ہوئی ڈولی میں بیٹھ جاتی ہے۔ ڈومنیاں بابل کے گیت دلدوز سُروں میں الاپنے لگتی ہیں جنہیں سُن کر عورتیں مرد بے اختیار رو پڑتے ہیں۔ لڑکی کا باپ اپنے سمدھی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہتا ہے "اب میری لاج آپ کے ہاتھوں میں ہے۔" لڑکے کا باپ اُسے گلے سے لگا کر تسلّی کے الفاظ کہتا ہے۔ دُلہن کی رشتہ دار عورتیں کچھ دور ڈولی کے پیچھے چلتی ہیں۔ ڈولی پر سکے نچھاور کئے جاتے ہیں جنہیں لوٹنے کے لئے بچوں کے غول جو اس موقع کی تاک میں لگے رہتے ہیں جھپٹ پڑتے ہیں اور خوب چھینا جھپٹی اور دھینگا مُشتی دیکھنے میں آتی ہے۔

ڈولی دُلہا کے گھر پہنچتی ہے تو داروگر گولے پر گولا داغتے ہیں جن کے دھماکوں سے دل سینوں میں دہل جاتے ہیں۔ کھیوَر دُلہن کی ڈولی دروازے پر رکھ دیتے ہیں اور جب تک اپنا لاگ

---

[1] ہوکنا یعنی بلند آواز میں اعلان کرنا۔

وصول نہیں کر لیتے دُلہن ڈولی کے اندر بیٹھی رہتی ہے۔ آخر دُلہن کو ساس اور نندیں باہر نکالتی ہیں اور بازوؤں سے تھام کر چوکھٹ پر لے آتی ہیں۔ دُلہن چوکھٹ پر کھڑی رہتی ہے جب تک اُسے چوکھٹ چھڑانے کا لاگ نہ دیا جائے۔ پھر اُس کی ساس چوکھٹ پر تیل چوآتی ہے اور دُلہن گھر میں داخل ہوتی ہے۔ رومۂ قدیم میں دُلہن سسرال والوں کی دہلیز پر آ کر رُک جاتی تھی تو دُلہا گودی میں بھر کے اُسے اندر لے جاتا تھا اور عورتیں مل کر نعرہ لگاتیں تھیں " تلاسیو " ! تلاسیو اُس زمانے کے ایک جوانِ رعنا کا نام تھا۔

دُلہن سمٹی سمٹائی حیا کی پتلی بنی پلنگ پر یا مسند سے لگ کر بیٹھ جاتی ہے۔ اُسے کھانے کو کچھ دیا جائے تو نہیں کھاتی خواہ بھوک سے نڈھال ہو رہی ہو۔ عورتیں اُسے مُنہ دکھلائی یا سلامی کی رقم دے کر باری باری نقاب اُٹھا کر دیکھتی ہیں۔ امیر گھرانوں میں مُصحف آرسی کی رسم ہوتی ہے جو بعض اوقات نکاح کے فوراً بعد اور کبھی کبھار سسرال میں ادا کی جاتی ہے۔ یہ رسم مُغل ایران سے لائے تھے۔ سیّد غلام حسین خاں لکھتے ہیں[1]

" دُلہن کو مسند پر بٹھا کر اُسے دوپٹے سے ڈھک دیا جاتا ہے۔ اُس کے ساتھ دُلہا بیٹھ جاتا ہے۔ دُلہا کے سامنے آئینہ رکھتے ہیں جس پر قرآن رکھ دیا جاتا ہے۔ اُس کے قریب ایک قینچی رکھتے ہیں۔ دُلہا اور دُلہن دونوں آئینے میں دیکھتے ہیں جس سے وہ ایک دوسرے کی شکل بھی دیکھ لیتے ہیں۔ اِس کے بعد دُلہا اپنی دُلہن کو مُنہ دکھلائی کی رقم دیتا ہے۔ نقاب اُٹھا کر اُس کا اُچٹتا ہوا نظارہ کرتا ہے اور اُٹھ کر باہر نکل جاتا ہے۔"

عرب ممالک شام، لبنان، مصر وغیرہ میں مُنہ دکھلائی کی رقم کو " حق کشف الوجہ " کہتے ہیں۔

رات گئے دُلہن کو عروسی کے کمرے میں بٹھا کر سب چلے جاتے ہیں۔ دُلہا ایک طرف جا کر لیٹ جاتا ہے گویا بہت تھکا ہوا ہے اور سو جانا چاہتا ہے۔ اُس کی پھوپھی یا خالہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر

[1] سیر المتاخرین

اُسے دُلہن کے پاس چھوڑ جاتی ہے اور دودھ کے دو گلاس تپائی پر رکھ کر چلی جاتی ہے۔ سونے سے پہلے دُلہن سسرال والوں کا دیا ہوا سالوُں ــــ کسی زمانے میں سوسی کی لال رنگ کی چادر ہوتی تھی ــــ کمر میں لپیٹ لیتی ہے۔ لال رنگ کا سالوُں لپیٹنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ داغ دھبّے دکھائی نہ دیں۔

مصر میں عروسی کی شب کو لیلۃ الدخلہ کہتے ہیں۔ دُلہا دُلہن کو ایک چٹائی پر بٹھا دیا جاتا ہے پھر دُلہن کا پیراہن آگے پھیلا کر دُلہا دو رکعت نماز یوں ادا کرتا ہے کہ وہ دُلہن کے دامن پر سجدہ کر سکے۔ پھر دونوں خلوت میں چلے جاتے ہیں۔ عورتیں علی الصباح بستر کی چادر ملاحظہ کرتی ہیں اور جب داغ دھبّے دیکھتی ہیں تو خوشی سے چیخیں بلند کرتی ہیں جنہیں عربی میں زغاریط کہتے ہیں۔ دُلہن کی ماں داغ دار چادر کو برادری کی عورتوں کو فخریہ دکھاتی پھرتی ہے کہ اُس کی بیٹی کی پاک دامنی اور ورجنٹی کا ثبوت مل گیا ہے۔

بیاہ کی رسُوم کے خاتمے پر ولیمہ سے فارغ ہو کر کمیوں کو کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کر دیا جاتا ہے۔ اِسے وِداگی (رخصت) کہتے ہیں۔ نائن البتہ دُلہن کو نہلانے اور بال سنوارنے کے لئے موجود رہتی ہے۔ دُلہن پہلی بار اپنے سسرال آئے تو برادری میں کچی پنّی ــــ چاولوں کا میدہ جس میں شکر ملائی گئی ہو ــــ تقسیم کی جاتی ہے پھر دُلہا دُلہن اکٹھے دُلہن کے گھر جاتے ہیں جسے مکلاوہ (رخصتی) کہتے ہیں۔ دُلہن تیسرے پھیرے اپنے میکے جائے تو اِسے "تروہیڈا" کا نام دیا جاتا ہے واپسی پر ساس اُسے کھچڑی پکانے کو کہتی ہے اور اُس روز سے دُلہن گھر کا کام کاج سنبھال لیتی ہے۔ دُلہن کی اُداسی دُور کرنے کے لئے اُس کے میکے والے مہینے میں دو ایک بار اُسے اپنے یہاں لے جاتے ہیں۔ جب بہو کا جی سسرال میں اچھی طرح لگ جائے تو یہ وقفے طویل تر ہو جاتے ہیں۔

پنجاب میں کسی گاؤں کی لڑکی دوسرے گاؤں میں بیاہی جائے تو وہ گاؤں والوں کا انگ کہلاتی ہے۔ انگ کی بیٹی بیاہی جائے تو وہ گاؤں والوں کی پڑتنگ بن جاتی ہے اور ہر طرح سے

اُس کی دلدہی کی جاتی ہے۔ لڑکیوں کو پیار سے "دھی دھیان" کہتے ہیں اور اُن کا بڑا آدر کرتے ہیں جب کبھی گاؤں میں دو فریق لڑ پڑیں اور دشمنی ہو جائے تو روٹھے ہوئے آدمی کو منانے کے لئے راضی کرنے والے اپنی "دھی دھیان" یعنی بہو بیٹیاں لے کر ناراض آدمی کے گھر جاتے ہیں جس پر اُس کے پاس راضی ہونے کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہتا۔

لڑکیاں جوان ہو کر ہر وقت اپنے بیاہ کے بارے میں سوچتی رہتی ہیں۔ جب تک لڑکی کی منگنی نہیں ہو جاتی وہ سخت پریشان اور بے کل رہتی ہے۔ گڈے گڑیا کا بیاہ رچانے کی تہ میں بیاہ کی آرزو مخفی ہوتی ہے۔ اُن کے سارے کھیل اسی تمنا کے گرد گھومتے ہیں حتیٰ کہ جب وہ پینگ جھولا رہی ہو تو بھی کہتی جاتی ہے۔ "ساہورے پیکے" گویا پینگ آگے کو جائے تو سسرال جا رہی ہوتی ہے اور مڑ کر پیچھے آئے تو میکے آتی ہے۔ اس سے ایک اور رسم وابستہ ہے۔ جب دلہن بن سنور کر تیار ہو جاتی ہے تو اُس کی ہر کنواری سہیلی کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ دلہن سب سے پہلے اُسے تھپکی دے۔ خیال یہ ہے کہ دلہن جسے سب سے پہلے تھپکی دے گی اُس کی شادی جلدی ہو جائے گی۔ اس لئے دلہن کے پاس کھڑی ہوئی لڑکیاں اُس کے گرد منڈلاتی رہتی ہیں کہ پہلے مجھی کو تھپکی دی جائے گی۔

برصغیر ہند و پاک کے شمالی مغربی علاقے میں بیاہ کی اکثر رسمیں ہندوؤں مسلمانوں میں مشترک ہیں بلکہ یہ کہنا قرین صحت ہوگا کہ بہت سی رسمیں ہندوؤں ہی سے لی گئی ہیں۔ ان علاقوں کے مسلمانوں کی اکثریت اُن ہندوؤں کی اولاد ہے جنہوں نے پٹھان سلاطین کے عہد میں اسلام قبول کیا تھا۔ مسلمان ہونے کے باوجود اُن کے یہاں شادی بیاہ اور موت فوت کی رسوم باقی و بحال رہیں۔ بعض رسمیں پٹھان، مغل اور ایرانی ساتھ لائے تھے جو سلاطین اور اُمرا کے واسطے سے رواج پا گئیں۔

ہندوؤں کی بیاہ کی رسمیں بھوتوں پریتوں، جادو کے ٹوٹکوں اور نظر بد کے دفعیے پر

مُشتمل ہیں۔ اُن کے ہاں دُلہا دُلہن کو سایہ سے بچانے کے لئے شگن بچارتے ہیں۔ اُن کے بیاہ کی رسمیں پنڈال یا بیدی کے نیچے ادا کی جاتی ہیں جسے بارہ برجوں کی رعایت سے بارہ چوبوں پر کھڑا کیا جاتا ہے۔ ان چوبوں پر سُرخ اور سفید رنگ کئے جاتے ہیں۔ بیدی پر لکڑی کے طوطے نصب کئے جاتے ہیں۔ طوطا کام دیو یا عشق کے دیوتا کی سواری ہے اِس لئے ہندوؤں میں پریم کی علامت بن گیا ہے۔ بیاہ کا پہلا دن مہورت کہلاتا ہے۔ جب تک بیاہ کی رسمیں جاری رہیں کُنڈ میں آگ جلتی رہتی ہے۔ لاون اور ویدی کے منتر سنسکرت میں ہوتے ہیں جو پنڈت مسلسل پڑھتے جاتے ہیں۔ لاون وہ گرہیں ہیں جو دُلہن کے سر پر سات بار رکھی جاتی ہیں۔ پھر دُلہا دُلہن کے کپڑوں میں گرہ دے کر انہیں آگ کے گرد سات سیاروں کی رعایت سے سات پھیرے دیئے جاتے ہیں اس کے بعد لڑکا اور لڑکی عُمر بھر کے ساتھی بن جاتے ہیں۔ ہندوؤں کے یہاں جو بیاہ لاون اور آگ کے گرد پھیروں سے کیا جائے وہ اٹُوٹ ہوتا ہے۔ اُن میں جُدائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھیروں کے بعد دُلہا کو دُلہن کے دائیں جانب بٹھا کر اُنہیں دھرو (قطب تارہ) کے درشن کرائے جاتے ہیں۔ برہمنوں کو بہت کچھ دان کیا جاتا ہے اور وہ کھا پی کر خوب تن تازہ ہوتے ہیں۔ یہودیوں کی طرح ہندوؤں میں بھی رخصتی کے وقت دلہن پر چاول یا گندم کے دانے نچھاور کئے جاتے ہیں تاکہ وہ پھلے پھولے۔ باپ اپنی بیٹی داماد کو بخش دیتا ہے۔ اِسے کنیا دان کہتے ہیں۔

طلاق

جاگیرداری نظامِ معاشرہ میں عورت کی کوئی میراث نہ تھی اُسے خاوند کی ذاتی املاک میں شمار کیا جاتا تھا۔ کالدیہ میں مرد از روئے قانون اپنی زوجہ کو لونڈی بنا کر بیچ دینے کا مجاز تھا۔ مرد نے خود تو ایک سے زیادہ عورتوں سے نکاح کرنے اور اس پر مستزاد بیسیوں لونڈیاں رکھنے کا حق اپنے لئے محفوظ کر لیا لیکن عورت کو ایک ہی مرد کے ساتھ گذر بسر کرنے کا پابند کر دیا۔ عورت کی کڑی نگرانی کی جاتی تھی اور بعض اوقات محض شبے کی بنا پر اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا تھا کہ اِس سے مرد کی عزت مجروح ہوتی تھی۔ عزت مرد سے مخصوص تھی، عورت سے عزت کے اظہار کی توقع نہیں کی جاتی تھی۔ ہندو معاشرے میں عورت اپنے شوہر کو پتی دیو جان کر اُس کی پُوجا کرتی تھی لیکن مرد اُسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا تھا۔ مجوسیت میں عورت پر عبادت فرض نہیں ہے گویا اُسے نماز کے قابل ہی نہیں سمجھا جاتا۔ البتہ اُس کا فرض ہے کہ وہ نمازوں کے اوقات میں شوہر کے پاس جا کر اُس کی رضا جوئی اور تالیفِ قلب کرتی رہے۔ میسور کی ریاست میں یہ دستور ہے کہ زوجہ پانی کا بدھنا اٹھائے اپنے پتی کے پیچھے پیچھے جنگل کو جاتی ہے اور فراغت کے بعد پتی دیو کا بدن صاف کرتی ہے۔ کلیسائے رُوم کے آباء ولی آگسٹائن، ولی کلیمنٹ وغیرہ عورت کو شیطان کا آلۂ کار سمجھ کر اُسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے رہے ہیں۔ کلیسائے یُونان کے مقدّس معبد میں جو یُونان کے کوہ آتھس پر واقع ہے کسی بھی عورت کے داخل ہونے کی ممانعت ہے۔

عورت کو قدیم زمانے سے یہ کھٹکا رہا ہے کہ کہیں اُس کا شوہر اُس سے بیزار ہو کر کسی

دوسری عورت کی جانب مائل نہ ہو جائے چنانچہ پڑھی لکھی عورتیں اپنے ہار سنگھار میں غلو کرتی رہی ہیں اور اَن پڑھ تعویذ گنڈوں اور ٹونے ٹوٹکوں سے اپنے شوہر کو رام کرنے کا جتن کرتی رہی ہیں۔ آج بھی عورتیں عاملوں سے تعویذ لکھوا کر انہیں پانی میں گھول کر اپنے مجازی خداؤں کو پلاتی ہیں تاکہ وہ اُن سے منہ نہ موڑ لیں۔ ایران اور ہندوستان میں اس مقصد کے لئے عورتیں سانپ کی کینچلی اور اُس کے دانت اپنے پاس رکھتی ہیں۔ رات کو اپنے بالوں میں کنگھا نہیں کرتیں نہ آئینہ دیکھتی ہیں مبادا وہ اپنے شوہروں کے التفات سے محروم ہو جائیں۔ ایرانی عورتیں حُبّ کے طلسماتی حروف ایک انگوٹھی پر کندہ کرا لیتی ہیں اور اس انگوٹھی کی چھاپ حلوے پر لگا کر شوہر کو کھلاتی ہیں۔ ہندوستان میں سہاگ کو قائم رکھنے کے لئے موسیٰ سہاگ کی قبر پر اُگے ہوئے چھپا کے پیڑ کی ٹہنیوں سے چوڑیاں آویزاں کی جاتی ہیں۔ شوہر کو سوکن سے برگشتہ کرنے کے لئے کسی بزرگ کے مزار پر چراغ جلانے کی منّت مانتی ہیں اور مجاوروں کو چراغی ادا کرتی ہیں۔ بانجھ پن کا الزام ہمیشہ عورت پر لگایا جاتا ہے۔ اِس امکان پر کبھی غور نہیں کیا جاتا کہ مرد بھی اولاد پیدا کرنے کے ناقابل ہو سکتا ہے بعض اوقات عورت کے سارے ٹونے ٹوٹکے ناکام ہو جاتے ہیں اور مرد اُسے طلاق دے کر نکاحِ ثانی کر لیتا ہے۔

مرد اور عورت کی نفسیات میں ایک نمایاں فرق یہ بھی ہے کہ مرد طبعاً ہرجائی ہوتا ہے اور ایک عورت پر قناعت نہیں کر سکتا جب کہ عورت ایک ہی مرد کے ساتھ اپنی ساری زندگی گذارنے کی تمنائی ہوتی ہے۔ کئی مذاہب نے مرد کو طلاق دینے کا یک طرفہ حق دے رکھا ہے جب کہ عورت کو اِسی حق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ چینیوں کے مذہب میں طلاق کی اجازت تھی بشرطیکہ شوہر اپنی بیوی کو اُس کا لایا ہوا جہیز لوٹا دے۔ اسلام سے پہلے عرب اپنی زوجہ کو تین بار جُدا جُدا طلاقیں دیا کرتے تھے۔ تیسری طلاق کے بعد اُن میں جُدائی ہو جاتی تھی البتہ طلاق بائن وارد ہونے سے پہلے رجوع کیا جا سکتا تھا۔ بعض قبائل میں عورت بھی اپنے شوہر کو طلاق دینے کی مجاز تھی اور وہ یوں کہ جب اُس کا شوہر کہیں باہر جاتا تو وہ خیمہ اُکھاڑ

کر اُس کا رُخ بدل دیتی تھی ۔ مرد لوٹ کر آتا اور یہ حالت دیکھتا تو اُس سے علاحدہ ہو جاتا تھا۔ عورت کو خلع کا حق بھی حاصل تھا لیکن اس صورت میں عورت کو وہ تمام اشیا اپنے شوہر کو واپس کرنا پڑتی تھیں جو وہ وقتاً فوقتاً اُس سے لیتی رہی تھی۔ عرب عورتیں طلاق یا خاوند کی موت کے بعد ایک سال عدت کا گذارتی تھیں۔ مطلقہ یا بیوہ میلے کچیلے کپڑے پہنے ایک طرف بیٹھ جاتی تھی۔ اِس دوران میں نہ وہ اپنا بدن صاف کرتی نہ ہی ناخن تراشتی تھی۔ ایک سال کے بعد وہ باہر نکل کر ایک مینگنی پھینکتی گویا وہ عدت کو مینگنی کی طرح حقیر سمجھتی ہے۔ نہا دھو کر صاف ستھرا لباس پہنتی اور خوشبو لگاتی تھی۔ کلیسیائے روم اور ہندومت میں طلاق کی قطعی ممانعت ہے ۔

اسلام میں صرف مرد کو طلاق کا حق دیا گیا ہے۔ عورت بھی خلع کر سکتی ہے لیکن اِس پر چند شرائط عائد کر دی گئی ہیں ۔ اسلام میں ایک ایک ماہ کے وقفے کے بعد ایک طلاق دینے کا حکم ہے۔ طلاق بتّہ یا طلاق بائن تیسرے مہینے کے بعد پڑتی ہے اور مرد عورت جُدا ہو جاتے ہیں ۔ طلاق بتّہ سے پہلے مرد اپنی عورت سے رجوع کر سکتا ہے۔ بعض فُقہاء کے ہاں ایک ہی بار تین طلاقیں اکٹھی دینے سے جدائی ہو جاتی ہے ۔ اگر شوہر نے غصّے میں آ کر ایک ہی نشست میں اکٹھی تین طلاقیں دے دی ہوں اور وہ بیوی سے رجوع کرنا چاہے تو اِن فُقہا کی رُو سے اُسے حلالہ نکلوانا پڑتا ہے یعنی اُس کی مُطلقہ کسی دوسرے شخص سے نکاح کر لیتی ہے جو خلوتِ صحیحہ کے بعد اُسے طلاق دے دیتا ہے اور عورت دوبارہ اپنے پہلے شوہر سے نکاح کر لیتی ہے ۔ اِس خدشے کے پیش نظر کہ ممکن ہے مستحل یا حلالہ نکالنے والا نکاح کے بعد عورت کو طلاق نہ دے کسی نہایت مسکین اور بدشکل آدمی کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں ۔ پُرانے وقتوں میں حلالہ اپنے کسی غلام سے کروایا جاتا تھا ۔ نکاح کی اگلی صبح شوہر یہ غلام اپنی زوجہ کو بخش دیتا تھا ۔ وہ اِسے قبول کر لیتی تو نکاح از خود منسوخ ہو جاتا تھا کیوں کہ از روئے شریعت

کوئی حرّہ (آزاد عورت) اپنے ہی غلام سے نکاح نہیں کر سکتی۔ بعض اوقات حلالہ ناکام رہتا کیونکہ مستحل طلاق دینے سے انکار کر دیتا یا زوجہ اپنے پہلے شوہر کے پاس جانا نہیں چاہتی تھی۔ اس صورت میں پہلے شوہر کو اپنی زوجہ سے ہاتھ دھونا پڑتے تھے۔ جس طرح بعض سُنّی فقہاء مُتعہ کو ناجائز سمجھتے ہیں اسی طرح بعض شیعہ علماء حلالہ کے جواز کے قائل نہیں ہیں۔ اسلام میں عورت کی عدّت چار ماہ دس دن رکھی گئی ہے۔ معتزلہ کے ہاں حاکم الشرع سے اجازت لئے بغیر طلاق دینا جائز نہیں ہے۔

موت

مریض پر جانکنی کی حالت طاری ہوجائے تو ہندو اُسے زمین پر لٹا دیتے ہیں اور اُس کا سر مونڈوا دیتے ہیں۔ بیاہتا عورت کے بال نہیں مونڈواتے۔ پھر میت کو غسل دیتے ہیں۔ برہمن منتر پڑھتے رہتے ہیں۔ عزیزوں کو دان دیتے ہیں۔ پھر زمین پر گائے کا گوبر مل کر اُس پر گھاس ڈال لیتے ہیں اور میت کو چت لٹا دیتے ہیں۔ اُس کا سر شمال کی طرف اور پاؤں جنوب کی طرف ہوتے ہیں۔ پھر اُس کے منہ میں گنگا جل چواتے ہیں۔ کچھ سونے کے ذرے بھی اُس کے منہ میں رکھ دیتے ہیں۔ اُس کے سینے پر تُلسی کے پتے رکھتے ہیں اور گئوُ دان کرتے ہیں۔ ماتھے پر دریائے گنگا کے کنارے کی مٹی کا تلک لگاتے ہیں۔ موت پر مُردے کا سب سے چھوٹا بیٹا، اُس کے بھائی اور قریبی عزیز سر کے بالوں اور ڈاڑھی مونچھ کا صفایا کرا دیتے ہیں۔[1] پھر میت کو دریا کے کنارے لے جاتے ہیں اور پلاس کی لکڑی کی چِتا تیار کرکے اُس پر لٹا دیتے ہیں۔ بیٹا چِتا کو آگ لگاتا ہے۔ امیروں کی چِتا میں چندن اور اگر کی لکڑیاں جلائی جاتی ہیں۔ دَم دینے سے پہلے مریض کے لئے گئوُ کا درشن کرنا ضروری ہوتا ہے۔ کشمیر کا ایک راجہ موت کے وقت اپنے محل کی تیسری منزل پر تھا۔ جان نکلنے سے پہلے اُسے گئوُ درشن کرانا ضروری تھا اس لئے ایک گائے کو رسوں میں جکڑ کر راجہ کے کمرے میں لے گئے اور راجہ نے گائے کی دُم پکڑ کر جان دی۔

پیارے لال آشوب نے ہندوؤں کے ہاں موت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔[2]

---

[1] اِسے بھدرا کہتے ہیں۔

[2] من سکھی اور سندر سنگھ کا قصہ (رسوم ہند)۔

"من سکھی مرگئی تو عورتوں نے جلدی سے اُس کے مُنہ میں تھوڑا سا سونا اور گنگا جل ڈال دیا۔ کیوں کہ ہندوؤں کے اعتقاد میں اِس عمل کے کرنے سے مُردہ سیدھا سُورگ کو چلا جاتا ہے.... سُندر سنگھ اپنے ساتھ اچارج کو بھی لایا اور دوسری چیزیں، چنری، کھاروا، تین بانس ایک پُولا، سُتلی۔ رولی، کلاوہ، مہندی، چوڑی، مسی، کاجل، کنشا، ایک کوری ٹھلیا، جَو کا آٹا، تِل، دھوتی، انگوچھا وغیرہ۔ بانسوں کی ارتھی بنائی، اُس کے اُوپر پُولا بچھا کر لال کپڑا ڈال دیا۔ عورتوں نے نعش کو نہلا کر نیا جوڑا پہنایا، آنکھوں میں سُرمہ، دانتوں میں مسی لگائی، سر میں تیل ڈال کر بال گوندھے، ہاتھوں میں چوڑیاں پہنائی۔ ساری رسمیں جو سہاگن کے مرنے پر کی جاتی ہیں پوری کیں۔ اِس کے بعد نعش کو ارتھی پر لٹا دیا، اُوپر چنری ڈال کر سُتلی اور کلاوے سے باندھ دیا اور پانی رولی اور پھول چنری کے اوپر رکھے، پھر اچارج نے سُندر سنگھ سے پنڈ دان کرایا اور سارے مرد نعش کے ساتھ ساتھ "رام رام ست ہے" کہتے ہوئے وہاں سے چلے، پھر پانچ چھ من لکڑیاں خریدیں۔ اچارج نے لکڑیاں بچھا دیں اور نعش کو اوپر رکھا اور سرہانا کچھ اُونچا رکھا۔ اِس کے بعد نعش کا مُنہ کھولا اِسے سُورج کے درشن کرائے پھر پُوڑے میں آگ رکھی اور لکڑیوں کو لگا دی۔ سُندر سنگھ نے چتا کی پرکما کی اور صندل کی ایک ڈلی آگ میں ڈال دی۔ آگ بھڑک اُٹھی تو کھوپڑی پر ایک آبخورہ گھی کا انڈیل دیا۔ نعش جل کر خاک ہو گئی اور ہڈیاں چن کر اکٹھی کر لیں اور گنگا جا کر ڈال آیا۔"

جب کسی عورت کا پتی مر جائے تو جب تک وہ اپنے رنڈاپے کے کپڑے گنگا میں نہیں ڈالتی تب تک پوتر نہیں ہوتی۔ جن کے ماں باپ مر جائیں وہ گنگا جا کر بھدر ہوتے ہیں یعنی سر کے بال اور ڈاڑھی مونچھ منڈواتے

ہیں۔ مجوسی مریض کے آخری وقت میں ایک سفید کتا جس کے کان بھورے ہوں یا چار چشمہ ہو اُس کے سامنے لاتے ہیں جسے دیکھ کر وہ دم توڑ سکے۔ اِسے "سگ دید" کہتے ہیں۔ مجوسیوں کے خیال میں سگ دید نہ ہو تو ایک بد رُوح مرنے کے بعد مُردے کے بدن میں گھس جاتی ہے اور اُس کے بہشت کو جانے میں مانع ہوتی ہے۔ مرنے والے پر سکرات کا عالم ہو تو مسلمان اُس کے پاس بیٹھ کر سورہ یٰسین کی تلاوت کرتے ہیں تاکہ وہ جان کندن کے کرب سے بچ جائے۔ سانس کی ڈوری ٹوٹ جائے، نبضیں ڈوب جائیں اور آنکھیں پتھرا جائیں تو لواحقین کی دھاڑیں اور چیخیں بلند ہوتی ہیں اور ہمسائے جان جاتے ہیں کہ مریض راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ مرنے والے کی آنکھیں فی الفور بند کر دی جاتی ہیں اور سر پہ ڈھاٹا باندھ دیتے ہیں تاکہ مُنہ کُھلا نہ رہ جائے۔ پنجاب کے دیہات میں قریب المرگ مریض کی کھاٹ نیچے سے کاٹ دیتے ہیں۔ کوئی مریض کا حال پوچھے تو کہتے ہیں "منجی کپ چھوڑی نیں" یعنی اب نہیں بچے گا۔

میت کو غسل دیتے وقت سُنّی نیم گرم اور شیعہ ٹھنڈا پانی استعمال کرتے ہیں۔ پانی گرم کرتے وقت اُس میں بیری کے پتے ڈال دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جنت میں اگا ہوا درخت سدرۃ المنتہیٰ بیری ہی کا پیڑ ہے۔ غسال کپڑے کا دستانہ پہن کر خشک مٹی سے میت کا بدن صاف کرتا ہے۔ مرد کے لئے تین پارچے اور عورت کے لئے پانچ پارچے کا کفن سلواتے ہیں جنہیں لنگ یا ازار الٹا پیراہن اور لفافہ کہتے ہیں۔ عورت کے کفن میں دامنی اور سینہ بند کا اضافہ کرتے ہیں۔ کفن پہنانے سے پہلے حنوط کرتے ہیں یعنی کافور اور گلاب کا آمیزہ میت پر چھڑکتے ہیں۔ جنازہ عزیزوں کے گریہ و بکا کی آوازوں میں اُٹھتا ہے۔ راستے میں کلمۂ شہادت کا ورد کرتے ہوئے کندھا بدلتے جاتے ہیں۔ جنازے پر مصلّیٰ اور قرآن رکھ دیا جاتا ہے۔ جنازہ پڑھا جائے تو مُردے کے قریبی عزیز اُسے قبر میں اُتارتے ہیں جس پہ اقارب پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگتے ہیں۔ قبر کی چنائی کے بعد سب لوگ قبر پر ایک ایک مٹھی مٹی ڈالتے ہیں۔ اِس موقع پر عیسائی کہتے

ہیں " خاک میں خاک " جیسا کہ ایک بھگتی شاعر نے کہا ہے " ماٹی کی دیہہ ماٹی میں مل جا " قبر درست ہوجائے تو کمیوں کو کچھ دے دلا کر رخصت کر دیتے ہیں۔ کچھ رقم گاؤں کی مسجدوں کے نام کر دی جاتی ہے۔ اسے " خرچ کرنا " کہتے ہیں۔ قبر پر مُلاّجی اور اُن کے شاگردوں کو قرآن خوانی کے لئے بٹھا دیتے ہیں۔

قدیم مصری اور یونانی بھی ہندوؤں کی طرح مردے کے منہ میں کچھ سونا یا کوئی سکّہ رکھ دیا کرتے تھے تاکہ عدم کا دریا عبور کرانے والا ملاّح کشتی کا کرایہ وصول کر کے رُوح کو عدم آباد پہنچا دے۔ گجرات کاٹھیاواڑ میں ہندو عورتیں اپنے پتی کی موت پر چوڑیاں توڑ دیتی ہیں اور سر کے بال مُنڈوا دئے جاتے ہیں۔ کسی زمانے میں ملایا میں یہ رواج تھا کہ جس گھر میں موت واقع ہوتی اُسے گھر والے چھوڑ کر کہیں اور چلے جاتے تھے خیال یہ تھا کہ موت کے فرشتے نے یہ گھر دیکھ لیا ہے۔ اب وہ چکر لگاتا رہے گا۔ جو شخص چیچک میں مبتلا ہو کر مر جائے اُسے جلاتے نہیں دفن کر دیتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اس کے چہرے پر چیچک کی صورت میں ستیلا دیوی خود نمودار ہوتی ہے اس لئے اسے جلانا پاپ ہے۔ قدیم زمانے کی بعض اقوام میں رواج تھا کہ مُردے کی ہڈیوں کو مٹّی کے مرتبانوں میں بند کر کے دفنا دیا کرتے تھے۔ ایسے کئی مرتبان ہڑپا اور کنعان کے شہروں کی کھدائی سے برآمد ہوئے ہیں۔ جوگیوں کی لاش کو بھی نہیں جلاتے بلکہ گڑھے میں دو زانو بٹھا کر دفن کر دیتے ہیں یا دریا میں بہا دیتے ہیں۔ جنوبی ہند کے لنگایت بھی اپنے مُردے دفن کرتے ہیں۔ مجوسی مُردے کو دخمہ ــــ مُردہ گھر ــــ کی چھت پر رکھ کر چلے آتے ہیں جہاں چیلیں، گدھ اور کوّے انہیں نوچ نوچ کر کھا جاتے ہیں۔ دخمہ پر ہر کہیں ہڈیوں کے ڈھانچے بکھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مجوسی مُردے کو جلانے یا دفن کرنے سے اس لئے گریز کرتے ہیں کہ اس سے عناصر اربعہ ــــ ہوا، مٹی، پانی، آگ ــــ آلودہ ہو جاتے ہیں۔ بودھ اپنے سوامیوں کے تبرکات دانتوں، بالوں اور ناخنوں کو دفن کر کے اُن پر چھتریاں تعمیر کرتے ہیں۔ فنِ تعمیر میں گنبد تعمیر کرنے کا اسلوب

بودھوں کی چھتریوں اور ستوپوں سے مستعار لیا گیا تھا۔ مسلمانوں کی قبر پرستی، مزاروں کی زیارت کو جانے اور وہاں منتیں ماننے اور اُن کے قریب اُگے ہوئے پیڑوں پر مَنّت کی دھجیاں اور فیتے لٹکانے کی رسمیں بودھوں ہی سے لی گئی ہیں۔

قدیم برطانیہ میں مُردے کو بٹھا کر دفن کیا کرتے تھے۔ ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ تراسیوں کے ہاں کوئی شخص مر جاتا تو خوشی کرتے تھے کہ اچھا ہوا دُنیا کے مصائب سے چھٹکارا پا گیا۔ چین میں بڈھوں کے جنازے باجے گاجے کے ساتھ اُٹھتے تھے۔ سلیمان تاجر نے ایک عجیب رسم کا ذکر کیا ہے [1]

"سراندیپ کا بادشاہ مرتا تو اِس کی نعش کو ایک گاڑی پر رکھ کر یوں چلتے ہیں کہ اُس کے سر کے بال زمین پر گھسٹتے جاتے ہیں۔ ایک عورت ہاتھ میں جھاڑو لئے پیچھے پیچھے چلتی ہے اور نعش کے سر میں خاک ڈالتی جاتی ہے اور کہتی جاتی ہے "لوگو! اِسے دیکھو اور دنیا کی لذّتوں سے بچو"

سلیمان تاجر کے بقول ہند کے بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ جب کوئی راجہ سنگھاسن پر بیٹھتا ہے تو وہ چاول پکواتا ہے جو وہ خود اور اپنے تین چار سَو ساتھیوں کو کھلاتا ہے۔ یہ گویا اِس بات کا عہد ہے کہ وہ زندگی اور موت میں راجہ کا ساتھ دیں گے۔ راجہ لڑائی میں مارا جائے تو اُس کے ساتھی لڑتے لڑتے مارے جاتے ہیں، طبعی موت مرے تو اُس کی چتا پر جل مرتے ہیں۔ مصرِ قدیم میں کسی کے گھر موت واقع ہوتی تو گھر کی عورتیں اپنی رشتہ داروں سمیت سروں میں خاک ڈال کر روتی پیٹتی بین کرتی ہوئی گلیوں میں گھومتی پھرتی تھیں۔ اس کی ممّی بننے تک گریہ وزاری کا عالم رہتا تھا۔ ہندو عورتیں سیاپا کرتی ہیں اور سینے اور رانوں پر زور زور سے دوہتّڑ مارتی ہیں۔ رات رات بھر چھاتی کوٹتی ہیں۔ ہر گاؤں میں کچھ عورتیں پیشہ ور نوحہ گر

[1] سلسلۃ التواریخ

ہوتی ہیں۔ وہ اس دردناک انداز میں مُردے کی خوبیاں بیان کرتی ہیں کہ سننے والوں کے سینے شق ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں سوگوار عورتیں مُردے کی ماں یا بہن سے گلے لگ کر روتی ہیں۔ وہ اپنے چہرے کو دوپٹے کے پلّو سے ڈھک لیتی ہیں اور گھر کی عورتوں کی بانہوں میں باہیں ڈال کر اپنے اپنے مرے ہوئے عزیزوں کے نام لے کر بَین کرتی ہیں۔ اس رسم کو گلے لگنا کہتے ہیں۔ باہر کے گاؤں سے پُرسے پر آنے والی عورتیں مُکان (تعزیت) دینے جھرمٹ کی صورت میں آتی ہیں۔ ساری راہ اِدھر اُدھر کی باتیں اور ہنسی چہل کرتی آتی ہیں۔ موت والا گھر قریب آجائے تو سروں سے دوپٹے اُتار کر کمر سے باندھ لیتی ہیں ـــــ انہیں سنگلے کہتے ہیں ـــــ اور دونوں باہیں اُوپر اُٹھا کر بین کرتی ہوئی موت والے گھر کے اندر داخل ہوتی ہیں۔ موت کسی گھرو کی واقع ہوئی ہو تو بڑی پٹّس پڑتی ہے۔ در و دیوار کانپنے لگتے ہیں۔ یہودیوں میں دستور تھا کہ جس گھر موت واقع ہوتی اُس کے سارے افراد سات روز تک ناپاک رہتے تھے۔

ایران قدیم میں کوئی سالار جنگ میں مارا جاتا تو اُس کے گھوڑے کے پیچھے پیچھے ماتمی جلوس کی صورت چلتے تھے۔ مولوی محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ ایرانی اپنے امیر کا بڑا ماتم کرتے ہیں۔ اُس کے گھوڑے کو سجاتے ہیں اور اُس کی ٹوپی زین کے ہرنے پر رکھتے ہیں۔ دونوں طرف دونوں موزے ایک طرف سپر، ایک طرف تلوار لٹکاتے ہیں۔ مقتول کا کمر پٹکا گھوڑے کے گلے میں لپیٹ دیتے ہیں۔ گھوڑے کی دُم کتر دیتے ہیں اور جنازے کے ساتھ ساتھ چکر دیتے ہوئے چلتے ہیں۔ آپ گریبان چاک، ننگے سر، راکھ مُنہ پر، روتے پیٹتے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسم قدیم ہے۔ ماوراء النہر کے ترکان صحرانشین میں بھی یہی دستور ہے۔ فردوسی نے جہاں سہراب کا جنازہ اُٹھایا ہے وہاں بھی یہ سامان درست کیا ہے۔ ؎

بُریدہ دُمِ بادپایاں ہزار — پُر از خاک سر مہتراں نامدار....

سپر پیش تابوت مے راندند — بزرگاں بسر خاک بفشاندند

کیکاؤس کے مظلوم بیٹے سیاوَش اور شہزادہ اسفندیار کے جنازے بھی اسی طرح اُٹھائے گئے تھے۔

ہندو ماں یا باپ کی موت پر ہر ماہ پنڈ دان کرتے ہیں یعنی چاول، گھی، شہد اور دودھ کا بڑا سا لڈو بنا کر رکھتے ہیں گویا مُردے کی دعوت کی جا رہی ہے۔ برہمن منتر پڑھ کر اس لڈو کا بھوجن کرتے ہیں۔ سوگواری کی رُسوم کو شرادھ کہتے ہیں۔ شرادھ پہ ہزاروں روپے اُٹھ جاتے ہیں اور غریب لوگ زیر بار ہو جاتے ہیں۔ شرادھ کی رسمیں برہمنوں نے اپنی پیٹ پُوجا کے لئے بنا رکھی ہیں۔

پنجاب میں جو دعوت موت پر دی جائے اُسے میدا کہا جاتا ہے۔ موت کے بعد پہلے چند روز رشتہ دار باری باری کھانا پکوا کر برادری کو کھلاتے ہیں۔ اسے "کُوڑا وٹہ" کہتے ہیں۔ سوئم، چالیسویں اور برسی کی دعوتیں ہندوؤں سے ماخوذ ہیں۔ سوئم کی دعوت سے پہلے فاتحہ خوانی ہوتی ہے۔ کپڑوں کے جوڑے، پھل کے خوان رکھتے ہیں اور پانی اور دودھ کے پیالے بھی اِن کے ساتھ رکھے جاتے ہیں۔ رسمِ فاتحہ کے بعد یہ چیزیں مُلّاجی کی نذر کی جاتی ہیں۔ سندھ میں سوئم کو ٹریو (تیزادن) اور چالیسویں کو چلیہو کہتے ہیں۔ پنجاب میں چالیسویں کی تقریب پر ساری برادری حاضر ہوتی ہے۔ فاتحہ کے بعد متوفی کے بڑے بیٹے کی دستار بندی ہوتی ہے گویا اُس کی جانشینی کی جاتی ہے۔

ہندوؤں کے ہاں مرنے کے چند طریقے ایسے ہیں جو مُردے کو سیدھا سورگ کو لے جاتے ہیں۔

(۱) گنگا جمنا کے سنگم پر بڑ کا ایک درخت ہے جس پر یاگ یا پریاگ راج کہتے ہیں۔ اس پر سے کُود کر گنگا میں ڈوب مرنا۔

(۲) گنگا کے منجدھار سمادھی لگا کر مرنا جیسا کہ سوامی رام تیرتھ نے خودکشی کی تھی۔ اقبال نے اس پر ایک نظم بھی لکھی تھی۔

(۳) جگن ناتھ دیوتا کا بُت پوری میں ہے۔ اُس کا سالانہ جلوس رتھ پر نکالا جاتا ہے۔ اس

رتھ کے پہیوں کے نیچے کُچلا جانا۔

(۴) ـــــــــ گائے کے اُپلوں کی چِتا بنا کر اُس پر جل مرنا۔

(۵) ـــــــــ کھانا پینا چھوڑ دینا اور بھوک پیاس سے نڈھال ہو کر پران تیاگ دینا۔

(۶) ـــــــــ بدن پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگانا اور جل مرنا۔

(۷) ـــــــــ کوہ ہمالیہ کی برف میں گل کر جان دینا جیسا کہ پانڈو بھائیوں اور دروپدی نے جان دی تھی۔

آج کل موت کے یہ طریقے متروک ہوتے جا رہے ہیں۔

انگریزوں کی آمد سے پہلے راجپوت قبائل میں ستی کا رواج تھا۔ عورت اپنے پتی کی چِتا پر بیٹھ کر جل مرتی تھی۔ جلال الدین اکبر نے اس کے انسداد کی کوشش کی لیکن اُسے خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ ستی کی رسم کا رگ وید میں کہیں ذکر نہیں ملتا۔ یہ رسم سیتھیوں کے ساتھ ہندوستان میں آئی۔ سیتھی اپنے سردار کی موت پر اُس کی زوجہ کو بھی اُس کی نعش کے ساتھ دفن کر دیا کرتے تھے۔ راجپوت سیتھیوں کی اولاد تھے۔ برہمنوں نے اُن کا شجرۂ نسب سُورج دیوتا اور چاند دیوتا سے جا ملایا، ستی کو نئی شکل دے کر اُن کے ہاں رواج دیا اور راجپوت سرداروں کی عورتیں اُن کی چِتا پر جل کر ستی ہونے لگیں۔ نیور نسر اپنے سفرنامۂ ہند میں لکھتا ہے کہ ستی ہونے والی عورت پان چباتی اور ڈھول تاشوں کی آواز پر تھرکتی ہوئی شوہر کی چِتا پر آتی تھی۔ وہ باری باری اپنے رشتہ داروں سے گلے ملتی اور چِتا کے گرد تین چکر لگا کر شعلوں کی طرف پیٹھ کر کے کھڑی ہو جاتی۔ برہمن اُسے دھکا دے کر آگ میں گرا دیتا۔ اس عورت کے پگھلے ہوئے سونے چاندی کے زیور برہمنوں کو ملتے تھے۔ بعض عورتوں کو برہمن اس اندیشے سے کہ وہ آگ سے ڈر کر بھاگ نہ جائیں شوہر کی نعش کے قریب رسیوں سے جکڑ کر بٹھا دیتے تھے۔ وہ حاضرین سے پوچھتی کہ وہ اپنے مرے ہوئے عزیزوں کو کوئی پیغام بھجوانا چاہیں تو اُسے بتلا دیں۔ اس پر کئی لوگ پھولوں کے ہار، خط پتر، کپڑے یا چاندی کے

سکتے لا کر دیتے کہ اُن کے مرے ہوئے رشتہ داروں کو پہنچا دے ۔ جو عورت آگ سے ڈر کر بھاگ جاتی اُسے پوہڑے چماروں کے حوالے کر دیا جاتا تھا جیسا کہ پنجابی کی ایک ضرب المثل سے عیاں ہے "بچّا توں لتھی تے چوڑیاں جوگی ہوئی"

پرانے وقتوں میں ہر کہیں حیات بعد موت یا رُوح کی بقا کا عقیدہ موجود تھا اس لئے بادشاہوں کی نعش کے ساتھ اُس کی کنیزیں، گھوڑے، ملازم، خورد و نوش کی چیزیں وغیرہ دفن کیا کرتے تھے۔ مصر میں ممّی بنا کر میت کو محفوظ کر لیا جاتا تھا تاکہ با (رُوح) جسم میں واپس آئے تو اُسے گلا سڑا نہ پائے۔ فرعون توت انخ آمن کے مقبرے سے ہر قسم کا بیش قیمت سامان برآمد ہوا ہے۔ یہی رواج منگولیا اور چین میں بھی تھا چین کے ایک شہنشاہ کے مقبرے سے دوسرے سامان کے ساتھ مٹی کے بنے ہوئے رتھ، گھوڑے اور سپاہی کھود کر نکالے گئے ہیں۔ اسلام سے پہلے عرب میت کو دفن کرتے وقت اُس کی قبر کے قریب گڑھا کھود کر اُس میں ایک اُونٹنی باندھ دیتے تھے جو بھوکی پیاسی مر جاتی تھی۔ مطلب یہ تھا کہ اگلے جہاں میں وہ سواری کے بغیر نہ رہے۔

تھریس کے باشندے ایک سے زیادہ عورتوں سے نکاح کرتے تھے۔ کوئی آدمی مر جاتا تو اُس کی بیویوں میں جھگڑا ہو جاتا کہ متوفی کس سے سب سے زیادہ پیار کرتا تھا اور کسے اُس کی نعش کے ساتھ قربان ہونے کا حق پہنچتا ہے۔ اس پر برادری اکٹھی ہو جاتی اور جس کے حق میں فیصلہ دیتی اُسے ذبح کر کے میت کے پہلو میں دفن کر دیا کرتے تھے۔[1]

جاپان میں ۱۹ ویں صدی کے اوائل تک ہراکری کر کے خودکشی کرنے کا رواج تھا لفظ ہراکری کا لغوی معنی ہے "پیٹ چاک کرنا"۔ اُمراء اِسے سپّوکو کہتے تھے جو ہر سمورائی (جوانمرد) کی عسکری تربیت کا لازمی حصہ تھا۔ کوئی سپہ سالار شکست کھا جاتا یا کسی مہم میں ناکام رہتا تو وہ اپنا پیٹ چاک کر کے مر جاتا تھا۔

---

[1] تاریخ ۔ ہیرودوٹس

عورت کے لئے پیٹ چاک کرنا ممنوع تھا۔ اُسے خنجر سے اپنا گلا کاٹنا پڑتا تھا۔ ناجائز تہمت لگنے پر شرفاء کی عورتیں اپنا گلا کاٹ کر مرجاتی تھیں۔ بعض اوقات کسی امیر پر بغاوت کا الزام ثابت ہوجاتا تو وہ بادشاہ سے گذارش کرتا کہ اُسے اور اُس کے بال بچے کو شکنجے کا عذاب دے کر نہ مارا جائے بلکہ ہراکری کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ اجازت ملنے پر وہ اپنے اہلِ خاندان سمیت ہراکری کر لیتا تھا۔ وِل ڈیوراں لکھتا ہے کہ شوگن ایاسو کے زمانے میں دو بھائیوں ساکون اور نائے نے اُس پر قاتلانہ حملہ کیا لیکن شوگن بال بال بچ گیا۔ یہ نوجوان شوگن سے اس بات کا انتقام لینا چاہتے تھے کہ اُس نے اُن کے باپ کی توہین کی تھی۔ شوگن نے کمال مہربانی سے اُنہیں سپّوکو کی اجازت دے دی اور اُس میں اُن کے خوردسال تیسرے بھائی ہاچی مورو کو بھی شریک کر لیا جس کی عمر صرف آٹھ برس کی تھی۔ اِس واقعے کا ایک عینی شاہد لکھتا ہے [1]

"جب تینوں بھائیوں کو ایک قطار میں بٹھایا گیا تو بڑا ساکون ننھے سے مخاطب ہو کر کہنے لگا" پہلے تم اپنا پیٹ چاک کرو۔ میں اطمینان کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے صحیح طریقہ اختیار کیا ہے"۔ ننھے نے جواب دیا" میں نے کبھی کسی کو ایسا کرتے نہیں دیکھا۔ پہلے آپ سپّوکو کریں۔ آپ کو دیکھ کر ہی میں صحیح طریقہ سیکھ سکوں گا"۔ بڑا بھائی آبدیدہ ہو کر بولا" بہت خوب ننھے تم ہمارے باپ کا بیٹا ہونے پر فخر کر سکتے ہو" پھر اُنہوں نے ننھے کو اپنے درمیان بٹھا لیا اور ساکون نے اپنے پیٹ کے بائیں جانب خنجر بھونک دیا اور کہا" دیکھو میرے بھائی اب تم سمجھے؟ خنجر کو زور سے مت بھونکنا کہ کہیں پیچھے کی جانب نہ گر پڑو۔ آگے کو جھکے رہنا اور گھٹنوں کو آپس میں ملائے رکھنا"۔ نائے نے بھی ایسا ہی کیا اور چھوٹے بھائی سے کہا" اپنی آنکھیں کھلی رکھو کہ تم پر مرنے والی عورت کا شبہ نہ ہو۔ اگر تمہارا خنجر اندر اٹک

[1] OUR ORIENTAL HERITAGE

جائے اور تمہیں کمزوری محسوس ہونے لگے تو حوصلے سے کام لینا اور خوب زور لگا کر پیٹ چاک کر دینا" ننھے نے پہلے ایک بھائی کی طرف دیکھا اور پھر دوسرے کی طرف اور اُن کے ساتھ اپنا پیٹ چاک کر لیا۔"

جاپان میں ہراکری کا رواج نہیں رہا لیکن آئے دن ایسی خبریں چھپتی رہتی ہیں کہ دو پیار کرنے والوں کو گھر والوں نے بیاہ کی اجازت نہ دی اور انہوں نے ہراکری کر لی۔

قدیم روما کے جوانمردوں اور رواقی فلاسفہ میں خودکشی کرنے کو مستحسن سمجھا جاتا تھا۔ جولیس سیزر کے قاتلوں میں ایک سردار کیسیس نامی تھا۔ جب اُس نے جولیس سیزر کے حامیوں سے شکست کھائی تو میدانِ جنگ سے بھاگ جانے کی بجائے اپنے غلام کو حکم دیا کہ اُس کا سر قلم کر دے۔ غلام نے حکم کی تعمیل کی۔ کلیوپیٹرا اور اُس کے عاشق انٹنی نے بھی اسی طرح جانیں دیں۔ جب اُن کی فوج جولیس سیزر کے بھتیجے اکٹیویس سے شکست کھا کر بھاگی تو انٹنی نے اپنے غلام سے کہا کہ اُسے موت کے گھاٹ اتار دے۔ غلام نے تلوار کا ایک بھرپور ہاتھ اپنے آقا کے مارا اور وہی تلوار اپنے سینے میں بھونک کر مر گیا۔ کلیوپیٹرا کو بتایا گیا کہ اُسے سنہری زنجیروں میں جکڑ کر فتح کے جلوس میں پھرایا جائے گا تو اُس نے اپنی چھاتی میں ایک افعی سے ڈسوا کر خودکشی کر لی۔

رواقی فلاسفہ کے خیال میں بعض حالات میں خودکشی روا ہے مثلاً جب کوئی رواقی کسی کرب ناک مرض میں مبتلا ہو جائے تو درد کی شدت سے چھٹکارا پانے کے لئے خودکشی کر لینا جائز ہے۔ قیصرِ روم نیرو کو شبہ تھا کہ اُس کا اُستاد سنیکا باغیوں سے ملا ہوا ہے۔ نیرو نے از راہِ کرم اپنے استاد کو کہلا بھیجا کہ بہتر ہے آپ خودکشی کر لیں ورنہ آپ کو عذاب دے کر مارا جائے گا۔ سنیکا نے نہایت سکون سے اپنے بازوؤں کی شریانیں کاٹ دیں اور مسکراتے ہوئے

موت کی آغوش میں چلا گیا۔

تبت کے بودھوں کا عقیدہ تھا کہ لاما کبھی نہیں مرتا۔ جب اُس پر نزع کا عالم طاری ہو تو پروہت اُس کی آتما کسی تین یا چار سالہ لڑکے کی رُوح میں منتقل کر دیتے ہیں اور وہ بچہ لاما بن جاتا ہے۔

هندوؤں کی رسم سپنڈانہ کرم کے نظریے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ تقریب مُردے کے یوم مرگ پر مناتے ہیں جب آتما دوبارہ اُس سریر میں داخل ہوتی ہے جہاں وہ کرم کی جزا یا سزا بھوگتی ہے۔ اِس تقریب پر برہمنوں کو بھوجن کرایا جاتا ہے۔

مذہبی رسمیں

ای . بی . ٹائلر نے رُوحوں کے مَت کو جادو ، دیو مالا اور مذہب کی اساس قرار دیا ہے۔
وہ کہتا ہے کہ غاروں کا انسان حالتِ خواب میں دیکھتا کہ وہ جنگل میں اِدھر اُدھر گھوم پھر رہا ہے یا اپنے مرے ہوئے عزیزوں سے ملاقاتیں کر رہا ہے جب کہ اُس کا جسم غار میں دراز ہے ۔ ان مشاہدات سے اُسے یقین ہو گیا کہ

(۱) ـــــــ اُس کے اندرون میں کوئی شے ایسی ضرور موجود ہے جو نیند کے عالم میں اُس سے جُدا ہو جاتی ہے اور بیدار ہونے پر دوبارہ اُس کے بدن میں لوٹ آتی ہے ۔

(۲) ـــــــ موت کے بعد یہ شے بدن میں واپس نہیں آتی بلکہ کسی اور عالم کو چلی جاتی ہے جہاں سے وہ کبھی کبھار اپنے عزیزوں کو ملنے آیا کرتی ہے ۔

اِس شے یا کایا کو بعد میں رُوح یا ہمزاد کے نام دیئے گئے ۔ مرورِ زمانہ سے رُوح کی بقا اور حیات بعد موت کے اِن تصورات پر مذہب کی عمارت اٹھائی گئی ۔ انسان نے آسمان ، سُورج ، چاند ، ستاروں ، دھرتی ، سمندروں ، دریاؤں ، چٹانوں وغیرہ کو اپنے آپ پر قیاس کر کے اُنہیں ذی رُوح ، ذی حیات اور ذی شعور ہستیاں تسلیم کر لیا جو اُن کی زندگی پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں ۔ بعد میں یہی ہستیاں دیوتاؤں ، دیویوں ، جنوں ، پریوں وغیرہ کے رُوپ دھار گئیں ۔ ان میں سُورج ، چاند ، تارے انسان کے دوست قرار پائے کیوں کہ وہ اُسے روشنی عطا کرتے تھے اور اندھیرا ، طوفان ، رعد و برق ، دشمن بن گئے کیوں کہ

وہ ہمیشہ اُس کے درپئے آزار رہتے تھے ۔ دوستوں کو خوش رکھنے اور دشمنوں کی تالیفِ قلب کے لئے معبد تعمیر کئے گئے جن میں انسان نے اپنی ہی شکل وصورت کے دیوتاؤں اور دیویوں کے مجسّمے بنا کر رکھے ۔ دوست دیوتاؤں کی مورتیاں قدرتاً خوبصورت تھیں جب کہ ایذا رساں دیوتاؤں کی شکلیں بھیانک اور بدوضع تراشی گئیں ۔ ان کی خوشنودی کے لئے انسان اِن پر وہی چیزیں بھینٹ کرنے لگا جو خود اُسے مرغوب اور عزیز تھیں: پہننے کے لئے قیمتی لباس، سجاوٹ کے لئے ہیرے جواہرات، کھانے پینے کے دُودھ مکھن اور پھل۔ اُس دَور میں لہو کو حیات کی علامت سمجھا جاتا تھا اِس لئے اُس نے قربان گاہوں پر جنگی قیدی اور بھیڑ بکریاں ذبح کرنے کا آغاز کیا تاکہ اُن کا بہتا ہوا لہو دیوتاؤں اور دیویوں کے لئے تقویت کا باعث ہو ۔ یہ رسُوم تھوڑے بہت فرق کے ساتھ جُملہ مذاہبِ عالم میں نفوذ کر گئیں ۔ اِن کے آثار آج بھی باقی ہیں ۔

دیوتاؤں کے معبدوں میں جا کر پُوجا پاٹھ کرنے ، ماتھا ٹیکنے ، چیزیں بھینٹ کرنے ، اِن کی حمد میں بھجن پڑھنے اور قربانیاں دینے کے طور طریقے پروہتوں نے وضع کئے جن کی اجارہ داری رسومِ عبادت پر قائم ہو گئی ۔ پروہتوں نے سادہ لوح عوام کو اِس بات کا یقین دلا دیا کہ اُن کے توسط اور امداد کے بغیر دیوتاؤں کو خوش رکھنا اور اُن سے کام لینا ممکن نہیں ہو سکتا گویا دیوتاؤں کو خوش رکھنے کے لئے پروہتوں کو خوش رکھنا ضروری ہے ۔ زرعی انقلاب کے بعد جو طفیل خوار طبقات معاشرہ صُورت پذیر ہوئے اُن میں سلاطین اور پروہت سب سے زیادہ طاقتور ہو کر اُبھرے ۔ سلاطین حفظِ مملکت کے نام پر باج اور لگان وصول کرتے تھے اور پروہت دیوتاؤں کی تالیفِ قلب اور حصولِ مُراد کے نام پر نذرانے بٹورتے تھے ۔ زمانے کے گذرنے کے ساتھ بادشاہوں اور پروہتوں یا تخت اور معبد میں کامل اتحاد ہو گیا ۔ بادشاہوں نے پروہتوں کو مالا مال کیا اور پروہتوں نے بادشاہوں کو دیوتاؤں کی اولاد قرار دے کر عوام پر اُن کا تسلط محکم کر دیا ۔

△

اَجداد پرستی

علمِ انسان کے ایک مکتبِ فکر کا خیال ہے کہ قدیم مذہب کا آغاز اجداد پرستی سے ہوا اور قبر ہیؔ معبد بن گئی۔ لوگ اپنے بزرگوں کی قبروں پر جا کر منتّیں مانتے تھے اور اڑے وقت میں اُن کی رُوحوں سے رجوع لاتے تھے۔ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ اُن کے بزرگوں کی ارواح اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور اپنے عزیزوں کی مدد کو آتی ہیں۔ آج بھی اہلِ مذہب اپنے اپنے پُرکھوں کے مزاروں کی زیارت کو آتے ہیں جہاں ہر سال میلے لگتے ہیں اور عرس (لُغوی معنیٰ شادی) کی تقریبات شان و شوکت سے منائی جاتی ہیں۔ مزاروں کو عرقِ گلاب سے غسل دے کر اُن پر نئی چادریں چڑھائی جاتی ہیں۔ عقیدت مند نذرانے لاکر پیرزادوں کے سامنے ڈھیر کر دیتے ہیں۔ حاجت مند تعویذ لکھواتے ہیں اور مزار کی جالیاں تھام کر عاجزی کے لہجے میں مرادیں مانگتے ہیں۔

مزاروں پر مجاوروں کا طبقہ شروع سے موجود رہا ہے۔ یہ لوگ مزار کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور زائرین سے نذرانے وصول کرتے ہیں۔ کلیسائے رُوم والے اپنے اولیاء کے مزاروں پر حاضری دیتے ہیں اور دعائیں مانگتے ہیں۔ اکثر اسلامی ممالک میں قُبّہ پرستی کا رواج باقی ہے۔ سندھ کی مثال خاص طور سے قابلِ ذکر ہے جہاں کی مسجدیں ویران پڑی ہیں اور درگاہوں پر دن رات گہما گہمی کا سماں دکھائی دیتا ہے۔ پرانے وقتوں میں قبروں پر قربانی کرنے کا رواج تھا۔ خیال یہ تھا کہ ذبیحہ کا خون مدفون کے لئے حیات بخش ہوتا ہے۔ ہومر کے بقول ٹرائے کے بادشاہ

پرائم کی بیٹی کسنڈرا کو یونان کے مشہور سورما اکیلیس کی قبر پر اور اُس کی بہن پولی زینا کو شاہِ سپارٹا کے مزار پر ذبح کیا گیا تھا۔

بزرگوں کی رُوحوں کی ضیافت بھی قدیم مذاہب سے یادگار ہے۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ دیوالی پر بزرگوں کی رُوحیں اپنے اپنے گھر کا چکر لگاتی ہیں۔ اس لئے اس تہوار پر طرح طرح کے پکوان اور مٹھائیاں بنوا کر اُن کی ضیافت کی جاتی ہے۔ برہمن منتر پڑھ کر یہ کھانے روحوں کو پہنچاتے ہیں اور پھر خود شکم سیر ہو کر کھاتے ہیں۔ ایران کے مجوسی ہمسپت سیدیا کے ایام میں کھانے پکوا کر دخموں اور گھروں کی چھتوں پر رکھتے ہیں تاکہ مُردوں کی رُوحیں بھوکی پیاسی نہ لوٹ جائیں۔ مسلمان بھی فاتحہ پر رُوحوں کی ضیافت کا اہتمام کرتے ہیں۔ قسم قسم کے کھانے دسترخوان پر چُنے جاتے ہیں۔ مُلّاجی اور اُن کے شاگرد فاتحہ کا ثواب رُوحوں کو پہنچاتے ہیں اور کھانے خود کھا کر تن تازہ ہوتے ہیں۔

بزرگوں کی پُوجا چین اور منگولیا میں بھی رائج تھی۔ مزاروں پر آنندروند کا جمگھٹ رہتا تھا۔ روزمرہ کی زندگی میں کسی پر مصیبت آتی تو وہ قبروں پر جا کر بزرگوں سے مدد مانگتا تھا۔ منگول سمجھتے تھے کہ رُوحیں پہاڑوں کی چوٹیوں پر بسیرا کرتی ہیں۔ وہ اپنے پروہتوں کے واسطے سے جنہیں شمن کہتے تھے ان رُوحوں سے رابطہ قائم کرتے تھے۔ روما میں بزرگوں کے ننھے منّے بُت بنوا کر طاقچوں میں رکھتے تھے اور صبح و شام اُن کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی عاجزی اور نیازمندی کا اظہار کرتے تھے۔

صابئیت

لفظ صبا کا معنیٰ ہے "ستارے کا طلوع ہونا"۔ صابئیت بہ معنیٰ ستارہ پرستی اسی سے مشتق ہے۔ اہلِ نظر کے خیال میں صابئیت دنیا کا قدیم ترین منظّم مذہب ہے جس کا آغاز کالدیا کے شہر بابل سے ہوا تھا۔ اہلِ بابل سات سیاروں شمس، چاند، زحل، عطارد، مریخ، زہرہ اور کیوان کی پوجا کیا کرتے تھے اور ان کے بت بنوا کر ان کے لئے معبد تعمیر کر لئے تھے۔ زہرہ حسن و عشق کی دیوی تھی جس کی پوجا عورتوں کے لئے مخصوص تھی۔ ان سب سیاروں کا سردار شمس تھا جسے نیرِ اعظم کہتے تھے اور جسے بادشاہ اپنا سرپرست مانتے تھے۔ سورج کی پوجا سمیریوں سے ماخوذ تھی۔ اس کا لقب "نجات دہندہ" تھا کیوں کہ وہ اندھیرے کے عفریتوں سے نجات دلاتا تھا۔ اسے روشنی کے علاوہ صداقت کا سرچشمہ بھی سمجھتے تھے۔ چاند کی پوجا عورتوں کے لئے وقف تھی کیوں کہ ان کے خیال میں چاند ان کی ماہواری پر اثر انداز ہوتا ہے اور کھیتوں کی بار آوری میں اضافہ کرتا ہے۔ عطارد شاعروں اور ادیبوں کا دیوتا تھا۔ جنگ جو مریخ کی پوجا کرتے تھے۔

صابئین سورج کے طلوع و غروب اور اس کی حرکت کے مختلف مراحل کے ساتھ سات نمازیں پڑھتے تھے اور ان میں رکوع و سجود کرتے تھے۔ مجوسیوں کی پانچ نمازیں انہی سے ماخوذ ہیں جنہیں وہ گاہ بھی کہتے ہیں۔ پنج گاہ یا پنجگانہ کے الفاظ پانچ نمازوں کے لئے وضع کئے گئے تھے۔ نماز کے وقت مجوسی پروہت یا مغ آتشکدے میں آگ کے سامنے بیٹھ کر اپنی مقدس کتابوں اوستا اور گاتھا کی آیات زمزمے سے پڑھتے ہیں۔ ان کا منہ کپڑے سے ڈھکا رہتا ہے تاکہ ان کی سانس سے مقدس آگ آلودہ نہ ہو جائے۔

نماز پڑھنے کے بعد سجدے میں گر پڑتے ہیں۔ مجوسیوں کی اصل نماز ستائش کہلاتی ہے جس میں سورج دیوتا مِتھرا کی تحمید و تمجید کی جاتی ہے۔ دن میں تین بار نیائش کرتے ہیں یعنی اپنی عاجزانہ عقیدت مندی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے اوقات ہیں طلوعِ آفتاب، دوپہر اور سہ پہر۔ صابئین نے سورج کی روزانہ گردش کے حساب سے اپنی نمازوں کے اوقات مُعین کئے تھے۔ فجر، طلوعِ آفتاب، اور دوپہر خوشی اور شکرانے کی نمازیں تھیں۔ سہ پہر اور شام کی نمازوں میں اِس خدشہ اور خوف کی ترجمانی کی جاتی تھی کہ سورج پر زوال آگیا ہے اب ممکن ہے اگلی صبح وہ طلوع ہی نہ ہو۔ آدھی رات کے وقت آخری نماز پڑھتے تھے جس میں اِلحاح وزاری سے سورج دیوتا سے طلوع ہونے اور انہیں اندھیرے سے نجات دلانے کی التجا کی جاتی تھی۔ اسرائیلی مذاہب میں بھی تھوڑے بہت فرق کے ساتھ نمازوں کے اوقات یہی مقرر کئے گئے۔ کلیسیائے روم کے پیرو طلوع و غروب کے اوقات کی نمازیں خاص اہتمام سے پڑھتے ہیں۔ صابئین نماز سے پہلے وضو کرتے تھے اور صاف ستھرے کپڑے پہنتے تھے۔ اُن کے یہاں غسلِ جنابت بھی ضروری تھا۔ وہ سورج گرہن اور چاند گرہن کی نمازیں بھی پڑھتے تھے۔ نمازِ جنازہ پڑھنے کا رواج بھی اُن میں تھا جس میں سجدہ نہیں کرتے تھے۔ ابو محمد علی ابن حزم اندلسی لکھتا ہے[1]

"رات دن میں اُن کی پانچ نمازیں[2] ہیں جو مسلمانوں کی نمازوں سے ملتی جلتی ہیں۔ رمضان کے روزے بھی رکھتے ہیں۔ اپنی نماز میں کعبے اور بیت الحرام کی طرف رُخ کرتے ہیں، مکّے، کعبے کی تعظیم کرتے ہیں، مُردار، خون اور سؤر کے گوشت کو حرام سمجھتے ہیں۔ اُن رشتے دار عورتوں کو بھی حرام سمجھتے ہیں جو مسلمانوں کے نزدیک حرام ہیں۔"

صابئین تیس دن کے روزے رکھنے کے بعد عید الفطر کا تہوار مناتے تھے۔ ۲۵۔ دسمبر کو جب سورج کا زوال

[1] الملل والنحل ترجمہ عبداللہ عمادی۔ [2] ابن حزم نے صابئین کی اشراق اور نصف شب کی نمازیں قلم زد کر دی ہیں۔

ختم ہوتا ہے اور اُس کی دوبارہ شمال کی طرف حرکت شروع ہو جاتی ہے۔ وہ سورج کے جنم دن کا جشن منایا کرتے تھے کیوں کہ انہیں اس خطرے سے نجات مل جاتی تھی کہ سورج جنوب کی طرف سرکتا سرکتا غائب ہو جائے گا۔ یہ جشن متھرا مت کے واسطے سے کلیسائے روم میں کرسمس کے نام سے بار پا گیا۔ متھرا مت کے پجاری دن میں تین مرتبہ سورج کی عبادت کیا کرتے تھے۔ پہلے پہر مشرق کی جانب مُنہ کر کے، دوپہر کو جنوب کی طرف رُخ کر کے اور شام کو مغرب کا رُخ کر کے رکوع و سجود کیا کرتے تھے۔

ہندوؤں کے ہاں دن میں تین بار یعنی طلوعِ آفتاب، دوپہر اور غروبِ آفتاب کے اوقات میں سندھیا واجب ہے۔ سورج کی پوجا کئی ناموں سے کرتے ہیں: سُوریہ، وِشنو، کرنا، مترا (بمعنی دوست، مجوسیوں کا متھرا) وِدسوت وغیرہ۔ اُن کا مقدّس ترین منتر ساوتری ہے جس میں سُورج کو مخاطب کر کے اُس کی حمد و ثنا کے ساتھ عقل و خرد کی روشنی عطا کرنے کی التجا کی گئی ہے۔ ایران میں اشاعتِ اسلام کے بعد بھی آفتاب کی پرستش کہیں کہیں باقی رہی۔ آفتاب کے پجاریوں کو شمسؔ کہتے تھے۔ جلال الدین اکبر بھی شمسؔ تھا۔ وہ دن میں چار دفعہ صبح، دوپہر، شام اور رات کو سُورج کی پوجا کرتا تھا۔ اُس نے سُورج کے ایک ہزار نام پنڈتوں سے سیکھے تھے اور وہ ان کا ورد کیا کرتا تھا۔ دوپہر کو خاص عقیدت سے حضورِ قلب سے یہ نام جپتا تھا۔ اُس کا قول ہے

"آفتاب نیّرِ اعظم ہے اور سارے عالم کو داد و دہش کرتا ہے، بادشاہوں کا مُربّی اور سرپرست ہے"۔

ہندوؤں کی سب سے بڑی پوجا ساشٹ ٹنگ سُورج کے لئے وقف ہے۔ ساشٹ ٹنگ یا آٹھ اعضاء کی پوجا دونوں ہاتھوں، دونوں پاؤں، دونوں گھٹنوں، ماتھے اور سینے کے بل لیٹ کر کی جاتی ہے۔ عام طور سے ہندوؤں کی پوجا کا طریقہ یہ ہے کہ پروہت پجاریوں کو سنکلپ (پوجا کی نیت) کراتا ہے۔ پیارے لال آشوب کے الفاظ میں۔

ایک شہابِ ثاقب تھا جسے صابئین کے خیال میں سورج دیوتا نے آسمان سے اُن کے لئے بھیجا تھا۔ حج کے لغوی معنیٰ چکّر لگانا یا قصد کرنا ہے۔ حج کے موقع پر کعبے کے گرد سات چکّر لگاتے تھے یعنی سات سیاروں کے حساب سے طواف کرتے تھے جو سورج کے گرد چکّر لگاتے ہیں۔ زمخشری لکھتا ہے کہ عورتیں مرد برہنگی کی حالت میں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سیٹیاں بجاتے اور تھرکتے ہوئے کعبے کا طواف کیا کرتے تھے، قربانی کرتے تھے اور تین چٹانوں شیطان الکبیر، الاولیٰ اور وسطیٰ پر سات کنکر پھینکتے تھے۔ صفا اور مروہ کی پہاڑیوں پر جاتے تھے جہاں بُت رکھے تھے۔ اسلام کے بعد ان بُتوں کو اُٹھوا دیا گیا۔ طواف کرتے وقت بایاں پہلو کعبے کی طرف رکھتے تھے۔ تین چکّر تیز تیز قدم اُٹھا کر لگاتے (ہرولا) اور چار آہستہ خرامی سے (رمل) حجرِ اسود[1] کو بوسہ بھی دیتے تھے۔

نبطیوں کا معبود ذوالشریٰ سورج دیوتا تھا جس کی پُوجا پتھر کی ایک بلند لاٹ یا ان گھڑ چوگوشہ سیاہ پتّھر کی صورت میں کی جاتی تھی۔ مکّہ کے علاوہ صابئین کا ایک معبد شام کے ایک شہر حمص میں تھا جہاں سورج کی پُوجا ایلا گابعل کے نام سے کی جاتی تھی۔ کعبے کی طرح اس میں بھی سیاہ پتّھر کا ایک ٹکڑا نصب تھا جو شہابِ ثاقب تھا اور جس کی پُوجا طواف کر کے کرتے تھے۔ قیصرِ روم ہیلیو گابالس جو نوعمری کے زمانے میں اس معبد کا پروہت رہ چکا تھا تخت نشیں ہو کر یہ سیاہ پتّھر روما لے گیا اور اُس کے لئے ایک شاندار معبد تعمیر کروایا۔ اس معبد کی قربان گاہ پر بچّے ذبح کئے جاتے تھے۔ سال میں ایک مرتبہ اِس پتّھر کو رتھ میں رکھ کر جلوس نکالتے تھے۔ اس رتھ کے آگے شیر جُتے ہوتے تھے۔

چاند دیوتا کی پُوجا بھی ہر کہیں ذوق و شوق سے کی جاتی تھی کیوں کہ وہ اندھیری راتوں کو جگمگا دیتا ہے اور تاریکی کی ہولناکی سے بچاتا ہے۔ دھوپ کی طرح چاندنی کو بھی فصلوں کی نشوونما کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ چاند اکثر ممالک میں بار آوری اور افزائشِ نسل کی علامت بن گیا تھا۔ ہندو اُس کی پُوجا سوم چندرما کی

---

[1] دبستان المذاہب میں حجرِ اسود کو کیوان دیوتا کی شبیہ کہا گیا ہے۔

اور سوم کے نام سے کرتے تھے۔ سوم ناتھ (چاند آقا) کی پوجا کے لئے کاٹھیاواڑ میں ایک عظیم الشان مندر تھا جس میں سوم کا بُت ایک معلق لنگ کی صورت میں رکھا گیا تھا۔ اس مندر کے ساتھ آٹھ ہزار دیہات کی آمدنی وقف تھی۔ ایک ہزار برہمن پوجا کے وقت بھجن پڑھتے تھے۔ پانچ سو دیوداسیاں سوم دیو کے رجھانے کے لئے صبح، دوپہر اور شام کو گاتی اور ناچتی تھیں۔ راجے مہاراجے اور اُمراء اپنی نوخیز لڑکیاں مندر کی بھینٹ کرتے تھے جنہیں پنڈت ناچ اور گانا سکھاتے تھے۔

چاند کا ایک بڑا معبد ملتان ــــ اصل مولستھان یعنی چاند کا مقام ــــ میں تھا۔ یہ بُت لکڑی سے تراشا گیا تھا جس پر سرخ رنگ کا غلاف منڈھ دیا گیا تھا۔ اس کی صرف آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں جن میں بیش بہا لعل جڑ دیئے گئے تھے۔ لوگ دُور دراز کے علاقوں سے جوق در جوق آتے اور اس بُت کا طواف کرتے تھے۔ مرورِ زمانہ سے لوگوں کے لائے ہوئے چڑھاووں سے اس مندر میں سونے چاندی کے انبار لگ گئے تھے۔ بعض اقوام میں چاند کو سورج کی زوجہ کہا جاتا تھا ــــ جاپان قدیم میں سورج کو چاند کی زوجہ کہا جاتا تھا اور شہنشاہ میکاڈو کے بارے میں کہتے تھے کہ وہ سورج دیوی کی اولاد ہے ــــ عربوں کی سب سے بڑی دیوی لات چاند دیوی ہی تھی جس کی شکل ایک مربع چٹان کی تھی۔

صابئین کی دھرتی دیوی عشتار حسن و عشق کی دیوی بھی سمجھی جاتی تھی۔ اس کا عظیم الشان معبد شہر بابل میں تھا جس کے صحن میں سینکڑوں دیوداسیاں ہار سنگھار کر کے ریشمی سراپردوں میں پجاریوں کے انتظار میں بیٹھا کرتی تھیں۔ لوگ منتوں کے چڑھاووں میں اپنی کمسن بچیاں عشتار کے مندر میں چھوڑ جاتے تھے۔ انہیں ناچ گانے کی تربیت دی جاتی تھی، اور وہ جوان ہو کر مقدس کسبیاں بن جاتی تھیں۔ پجاری اور اور یاتری ان سے بلا تکلف تمتع کرتے تھے۔ خیال یہ تھا کہ عشتار کے معبد میں جنسی ملاپ ہوگا تو دھرتی کی ثمرآوری اور زرخیزی کو تقویت بہم پہنچے گی اور فصلوں کی برداشت زیادہ ہوگی۔ ان مقدس کسبیوں کی کمائی

پروہتوں کی جیب میں جاتی تھی۔ بابل کا ایک قانون یہ تھا کہ شہر کی ہر عورت کو دیوی کے معبد میں اپنی زندگی میں کم از کم ایک بار کسی نہ کسی یاتری سے جنسی ملاپ کرنا پڑتا تھا۔ اس مقصد کے لئے امیروں کی عورتیں گاڑیوں میں آتی تھیں اور رنگ برنگ کے سراپردے لگا کر بیٹھتی تھیں جب کہ غریب عورتوں کو مقدس حجروں کے سامنے زمین پر بیٹھنا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ جو عورت مندر کی چار دیواری میں داخل ہو جاتی وہ یہ فرض پورا کئے بغیر باہر نہیں جا سکتی تھی۔ جب کوئی یاتری کسی عورت کی گود میں چاندی کا سکہ پھینک کر کہتا "دیوی تجھ پر مہربان ہو" تو وہ چپ چاپ اُس کے ساتھ حجرے میں چلی جاتی تھی جو اس مقصد کے لئے دو رویہ تعمیر کئے گئے تھے۔ ہیروڈوٹس کہتا ہے کہ شہزادیوں کو بھی اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے اس معبد میں آنا پڑتا تھا۔ دھرتی دیوی کا یہ مت اکثر اقوام میں نفوذ کر گیا۔ آلتس، سائبیلی، عشتورت، عشترتی، اناھتا دھرتی دیویاں ہی تھیں جن کے مندروں میں جنسی ملاپ کی عام آزادی تھی۔ بابل کے علاوہ قبرص، بافوس، کورنتھ اور افاکا مقدس عصمت فروشی کے گڑھ سمجھے جاتے تھے جہاں سال بھر یاتریوں کے ٹھٹ لگے رہتے تھے کنعان میں ان دیوداسیوں کو کدیشہ کہتے تھے۔ ھندوستان میں لوگ اپنی کمسن بچیاں دیوی کی بھینٹ کرتے تھے۔ برہمن انہیں ناچ گانے سکھاتے تھے۔ وہ پوجا کے اوقات میں بھاؤ بتا بتا کر گاتیں اور کولہے پھڑکا پھڑکا کر ناچتی تھیں۔ ان کی کمائی "قدرۃ" برہمن وصول کرتے تھے۔ جنوبی ہند کے مندروں ترویتی اور سری رنگم میں آج بھی یہ دھندا کرتی ہیں۔ بانجھ عورتیں ترویتی کے مندر میں اپنے سر کے بال کاٹ کر بھینٹ کرتی ہیں۔ کھمبایت کے نواح میں ایک مندر کسبیوں کے لئے مخصوص ہے جہاں وہ بیش قیمت چڑھاوے لاتی ہیں۔ کلکتہ میں کالی دیوی کے مندر میں اپنے سر کے بال کٹوا کر مقدس بھوسر کے پیڑ کی شاخوں سے لٹکتی ہیں۔ بعد میں دھرتی دیوی کی پوجا کی کئی رسمیں کلیسائے روم میں بار پا گئیں۔ رومن کیتھولک پادری دھرتی دیوی کے پجاریوں کی طرح ڈاڑھی مونچھ کا صفایا کراتے ہیں، سر کے بال گول تھالی کی شکل میں مونڈواتے ہیں، عمر بھر کنوارے رہتے ہیں، رنگ

برنگ کے ریشمیں کپڑے پہنتے ہیں۔ عبادت کے وقت نابالغ لڑکوں کی منڈلیاں مقدس گیت گاتی ہیں۔ دھرتی دیوی کے معبد ہیں بدارواح کو دور بھگانے کے لئے گھنٹیاں بجاتے تھے گرجوں میں عبادت گذاروں کو بلانے کے لئے بجاتے ہیں۔ یہ رسمیں دھرتی دیوی ساتی بیلی وغیرہ کے مت سے یادگار ہیں۔

صابئین کی طواف کی ریت بھی دور دور تک رواج پاگئی۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے صابئین سمجھتے تھے کہ جس طرح سیارے سورج کے گرد چکر لگاتے ہیں اسی طرح بتوں اور معبدوں کا طواف پجاریوں پر فرض ہے۔ ہندوستان میں پرکما (اصل پروکھشنا) یا طواف پوجا کا لازمی حصہ ہے۔ راجے مہاراجے دربار میں جانے سے پہلے گائے بیل کا پرکما کرتے تھے۔ اسلام کی اشاعت سے پہلے کے عرب جہاں کہیں قیام کرتے وہیں ایک پتھر کھڑا کر لیتے اور اسے دیوتا سمجھ کر اس کا طواف کرتے اور قربانی کرتے تھے۔ ان پتھروں کو انصاب کہتے تھے۔ طواف سے ایک اور رسم وابستہ ہے۔ ایران اور ترکستان میں کوئی شخص بیمار پڑ جاتا تو غلاموں سے کہتے کہ مریض کے پلنگ کے گرد چکر لگا کر باہر نکل جائیں۔ کہتے تھے باہر جانے والے مرض اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور مریض شفایاب ہو جاتا ہے۔ شاہجہاں بیمار پڑا تو اس کی بیٹی جہاں آرا نے کئی لونڈیوں غلاموں سے کہا کہ بادشاہ کے پلنگ کا چکر لگا کر باہر چلے جائیں۔ گلبدن بیگم لکھتی ہے کہ اس کا بھائی ہمایوں بیمار پڑ گیا۔ اس کی حالت دگرگوں ہو گئی تو ظہیر الدین بابر نے اضطراب کی حالت میں جناب مولا علیؑ بن ابی طالب کا تصور کر کے اپنے بیٹے کے پلنگ کا طواف کیا چنانچہ ہمایوں شفایاب ہو گیا اور بابر چل بسا۔ یونانی برھنگی کی حالت میں طواف کیا کرتے تھے کیوں کہ ان کے یہاں برھنگی صداقت کی علامت تھی۔ سکندر اعظم نے جنگ ٹرائے کے ہیرو اکیلیس کی قبر کا طواف مادر زاد برہنہ ہو کر کیا تھا۔ سپارٹا میں نوجوان لڑکے لڑکیاں مذہبی جلوسوں میں برہنہ ہو کر شامل ہوا کرتے تھے۔

زمانے کے گذرنے کے ساتھ صابئین کے یہاں آفتاب جو سب سیاروں کا بادشاہ تھا بعل مردوخ کی صورت میں خداوند خدا بن گیا۔ یہ گویا وحدانیت کا ابتدائی تصور تھا جو مجوسیوں میں اہورا مزدا اور

یہود میں یہواہ سے وابستہ ہو گیا۔ شخصی اور ملّی خدا کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کے لئے کسی نہ کسی واسطے کی ضرورت تھی چنانچہ مجوسیوں نے فرشتوں ـــ فرشتہ، لغوی معنی بھیجا ہوا ـــ کا تصوّر پیش کیا۔ سروش ان فرشتوں کا سردار بنا دیا گیا جو اہورامزدا کے پیغامات کیخسرو اور خسرو پرویز کے پاس لایا کرتا تھا جیسا کہ فردوسی نے شاہنامے میں ذکر کیا ہے۔ مصر میں فرعون اخناتن نے آتن (قرصِ آفتاب) یا آفتاب کی علامت کو واحد خداوند قرار دیا اور اُس کے بُت تراشنے کی مخالفت کر دی۔ فرعون نے آتن کی حمد میں پُرجوش بھجن لکھے۔ اس طرح دنیا کے دو بڑے تمدنوں میں آفتاب کو خداوند خدا کا درجہ دے دیا گیا اور یوں انسانی فکر و تخیّل کا ارتقاء کثرت پرستی سے واحدانیت کی طرف ہونے لگا۔ البتہ اکثر اقوام بدستور کثرت پرستی میں مُبتلا رہیں اور اُن کے ہاں اجداد پرستی کی قدیم روایات برابر پنپتی رہیں۔ خود مصر میں اخناتن کی موت کے بعد پروہتوں نے دوبارہ کثرت پرستی کو رائج کر دیا۔ مصری حیوانات، پرندوں، چٹانوں، پھولوں حتیٰ کہ کیڑے مکوڑوں کی پُوجا بھی کیا کرتے تھے اور ان کے ہزاروں بُت بنا رکھے تھے۔ وہ گائے بیل اور بچھڑے کی پُوجا انہماک سے کرتے تھے اور بعد کے مجوسیوں اور ہندوؤں کی طرح گائے کا بول تبرکاً پیتے تھے۔ مُقدس بیل اے پس اور مُقدّس بکرے کی زوجیت میں خوبرو جوان عورتیں دیا کرتے تھے۔ بنی اسرائیل مصر سے نکلے تو سانڈ اور سانپ کی پُوجا اپنے ساتھ لائے۔

اکثر اقوام میں پہاڑوں کی چوٹیوں، چٹانوں، پتھروں کی پُوجا کا رواج تھا۔ عربوں کے بُت دو قسم کے تھے ایک اَن گھڑ اور دوسرے جن پر کوئی نہ کوئی شکل تراش دی گئی تھی۔ انہیں ذی حیات سمجھ کے ان سے دعائیں مانگا کرتے تھے۔ ہندوستان میں برہمن آج بھی ایک سیاہ رنگ کے اَن گھڑ پتھر کی پُوجا ذوق و شوق سے کرتے ہیں اسے سالگ رام کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کوئی بُت ٹوٹ جائے تو وہ پُوجا کے لائق نہیں رہتا لیکن سالگ رام کے ٹکڑے بھی قابلِ پرستش ہیں۔ یہ پتھر نیپال کے قریب دریاؤں سے نکالا جاتا ہے۔ فارسی میں اسے سنگِ سماق کہتے ہیں۔

صخرہ کو (لغوی معنی چٹان) یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے ہاں مقدس خیال کیا جاتا ہے۔ یہ ایک نیلے رنگ کی قدِ آدم چٹان ہے جس کی گولائی دو سو فٹ ہے۔ کنعان میں بنی اسرائیل کی آمد سے پہلے اس پر جانور ذبح کر کے قربانی دیتے تھے۔ ذبیحہ کا خون بہنے کے لئے اس کے ایک طرف نالی تراش دی گئی۔ ابن خلدون کے بقول اس کے گرد ایک شاداب باغیچہ تھا اور چٹان پر بت رکھ دیا گیا تھا۔ بنی اسرائیل نے یہ بت توڑ دیا اور حضرت داؤدؑ نے اس کے گرد ہیکل تعمیر کرنے کی طرح ڈالی جس کی تکمیل اُن کے بیٹے حضرت سلیمانؑ نے کی۔ ہیکل سلیمانی ایک نہایت عالیشان عمارت تھی جس کے در و دیوار پر سونے کے پترے جڑے تھے۔ اس کا مقدس ترین حجرہ وہ تھا جو صخرہ کا احاطہ کئے ہوئے تھا۔ یہ حجرہ تیس فٹ لمبا اور تیس فٹ چوڑا تھا۔ اسے القدس کہتے تھے۔ اس میں تابوتِ سکینہ جس میں الواحِ شریعت، عصائے موسیٰ، سات شاخہ شمعدان اور مَنّ کا مرتبان رکھے تھے محفوظ کر لیا گیا۔ ہیکل سلیمان کو شاہ بابل بنوکد نضر نے تباہ و برباد کر دیا۔ یہی چٹان مسلمانوں کا قبلۂ اوّل بھی تھی۔ جب مسلمان فاتحانہ یروشلم میں داخل ہوئے تو انہوں نے اس چٹان پر ایک گنبد تعمیر کرا دیا جسے قبۃ الصخرۃ (چٹان کا گنبد) کہنے لگے۔ ایک روایت کے مطابق آنحضرتؐ اسی چٹان پر سے معراج کو گئے تھے۔ یہودی کہتے ہیں کہ ہیکل سلیمانی کی یادگار ایک دیوار رہ گئی ہے جس کے ساتھ وہ لپٹ کر روتے ہیں اور پکار کر کہتے ہیں "خداوند خدا! اپنا گھر جلدی تعمیر کر"۔ اسے دیوارِ گریہ کہتے ہیں اور اس کے کنکر خاکِ شفا کی طرح تبرکاً لے جاتے ہیں۔

پہاڑی چوٹیوں کو دیوتاؤں اور ارواح کے مسکن سمجھ کر اُن کی پوجا کرتے رہے ہیں۔ یونان کا کوہ المپس، ایران کا البرز، قفقاز کا دماوند، ہند کا سمیرو اس ضمن میں قابلِ ذکر ہیں۔ مشرقی ممالک میں ایسے پتھروں کو بھی مقدس سمجھتے رہے ہیں جن پر کسی بزرگ کے ہاتھ یا پاؤں کا نشان موجود ہو۔ ہندو ہر سال گیا کے مندر وشنو پد میں آتے ہیں جہاں اُن کے عقیدے کے مطابق وشنو دیوتا کے پاؤں کا نقش ایک پتھر پر دکھائی دیتا

ہے۔ اس نقش کے سامنے ہندو عورتیں اپنے سر کے بال کاٹ کر بھینٹ کرتی ہیں۔ نیشاپور سے بیس میل کی دوری پر ایک گاؤں ہے جہاں ایک پتھر پر امام رضا کے پاؤں کا نقش دکھائی دیتا ہے۔ اسے قدم گاہ کہتے ہیں جس کی زیارت کے لئے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ مشہد کی ایک گلی میں امام رضا کے پنجے کا نشان ایک پتھر پر لگا ہوا ہے۔ یہاں بانجھ عورتیں چراغ جلاتی ہیں اور منتیں مانتی ہیں۔ حیدرآباد دکن میں ایک چٹان پر جناب مولا علی کے ہاتھ کے پنجے کا نشان موجود ہے۔ روایت یہ ہے کہ جناب مولا علیؑ نظام دکن میر عثمان علی خان کو ایک رات خواب میں دکھائی دیئے۔ نظام نے اس خواب کی یادگار ایک زیارت گاہ تعمیر کروائی جس کا نام مولا علیؑ ہے۔ یہ زیارت گاہ پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے۔ عثمان علی خان بڑھاپے میں بھی سال میں ایک بار چار سو بچانوے سیڑھیاں چڑھ کر اس زیارت گاہ پر حاضری دیا کرتے تھے۔ چٹان پر جہاں پنجۂ مولا علی کا نشان ہے انہوں نے صندل کا لیپ کروادیا ہے۔ آج بھی حاجت برآری کے لئے عورتیں مرد درگاہ مولا علیؑ پر جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جلال جہانیاں جہانگشت مکہ سے قدم رسولؐ لائے تھے جو دلی میں موجود ہے۔ سکھوں کا گوردوارہ پنجہ صاحب حسن ابدال میں گورونانک کے پنجے کے لئے تعمیر کیا گیا تھا۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ اکبر کے وزیر شمس الدین خوافی نے حسن ابدال میں چشمے کے پانی کے لئے ایک تالاب کھدوایا تھا۔ حکیم ابوالفتح اور ان کے بھائی حکیم ہمام یہیں مدفون ہوئے۔ بعد میں سکھ گرنتھیوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ وہ کہتے تھے کہ یہاں ایک دفعہ گورونانک نے لڑھکتی ہوئی چٹان کو اپنا ہاتھ رکھ کے روک لیا تھا جس سے ان کے پنجے کا نشان چٹان پر پڑ گیا۔

مصریوں کی طرح ہندو بھی دریاؤں کو دیوتا سمجھ کر انہیں پوجتے رہے ہیں۔ دریاؤں میں گنگا، جمنا، سرسوتی، سرجو، گوداوری، گنڈک، جھیلوں میں پشکر (نزد اجمیر) کٹاس (نزد چوآسیدن شاہ ضلع جہلم) کورو کھشیتر اور غاروں میں ایلورا وغیرہ کی پوجا کرتے رہے ہیں۔

فکری ارتقاء کے ساتھ ارواح پرستی، جادو اور دیو مالا کے آثار اکثر ترقی یافتہ ملکوں میں ناپید ہو چکے ہیں البتہ آسٹریلیا، افریقہ، ملیشیا، جزائر شرق الہند اور جنوبی ہند کے جنگلی قبائل میں بدستور پرکھوں کی پوجا کی جاتی ہے کیوں کہ یہ ممالک ترقی تہذیب وتمدن کے سفر میں دوسری اقوام سے بچھڑ کے رہ گئے ہیں۔ ہندوستان واحد "مہذب" ملک ہے جہاں انسانی شعور کے ارتقاء کے جملہ مراحل ترتیب وار ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس ملک کو قدیم ترین منتوں، جادو کے ٹونے ٹوٹکوں، دیو مالائی رسوں، اجداد پرستی، بت پرستی، قبر پرستی، تبرکات پرستی کے ساتھ ساتھ توہمات وخرافات کا عجائب گھر سمجھا جا سکتا ہے جس کی سیر آنے والے وقتوں میں علم انسان اور تقابلی مذہب کے طلبہ کے لئے دلچسپی کا باعث ہوتی رہے گی۔

پرانوں کی اشاعت کے ساتھ ہندوؤں نے ویدک مذہب کو پس پشت ڈال دیا۔ پرانوں میں اخلاق سے زیادہ پوجا پاٹھ کی رسوم ادا کرنے پر زور دیا گیا جس سے پوجا ان کی گھٹی میں پڑ گئی اور انہوں نے معمولی سے معمولی چیزوں کو پوجنا شروع کیا مثلاً دیوالی کے تہوار پر برکت اور خوشحالی کے لئے ہر کاریگر اپنے اپنے اوزاروں کی پوجا کرتا ہے۔ کائستھ قلم دوات کو پوجتے ہیں۔ نائی آئینے کی، ترکھان تیشے کی، مچھیرا جال کی، جھیور بہنگی کی، درزی قینچی کی، لوہار دھونکنی کی اور موچی رنبی کی پوجا کرتا ہے۔

آریا ۱۵۰۰ ق م کے لگ بھگ ہندوستان میں داخل ہوئے تو وہ ایرانیوں کی طرح صابئیت کے زیر اثر تھے اور سورج، چاند، برق ورعد، آگ وغیرہ کو پوجتے تھے۔ بت پرستی کا رواج بقول مورخ فرشتہ کشمیر سے لیا گیا۔ وہ کہتا ہے کہ بکرماجیت کے عہد تک انہوں نے اپنا قدیم مذہب ترک کر دیا تھا۔ بعض مورخین کے خیال کے مطابق باختری یونانیوں کی پیروی

میں بودھوں نے گوتم بدھ کے بت تراشنا شروع کیے جیسا کہ گندھارا فن سنگ تراشی سے مفہوم ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ لفظ بت بدھ ہی کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ برہمن مت کے احیاء اور تنتر مت کی اشاعت کے ساتھ ہندو ترمورتی ـــــ ایک دھڑ پر وشنو، شیو اور برہما کے چہرے ـــــ اور کالی یا درگا کے مجسمے تراشنے لگے جس سے بت پرستی ہر کہیں نفوذ کر گئی۔ نووارد آریا نے دراوڑی دیومالا سے وشنو، شیو اور کرشن جیسے دیوتا اور کالی دیوی مستعار لی تھی۔ پانچویں صدی (ب م) عیسوی میں دھرتی پوجا کا ہر کہیں رواج ہو گیا اور اس کے ساتھ لنگ پوجا ہند کے کونے کونے میں مقبول ہو گئی۔ لنگ یونی پوجا کے ساتھ ناگ کی پوجا بھی دراوڑوں سے لی گئی تھی۔

○

لِنگ پُوجا

وادیٔ سندھ کے قدیم شہروں ہڑپا اور موہن جو ڈرو کے کھنڈروں سے لِنگ یونی کے جُڑے ہوئے مجسّمے (اصطلاح میں اِسے کُنڈی کہتے ہیں) برآمد ہوئے ہیں۔ لِنگ یُونی کی پُوجا زمانۂ قدیم کے زرخیزی کے مت اور مادری نظامِ معاشرہ سے یادگار ہے۔ زرعی معاشرے میں بار آوری کے مُتوں نے جنم لیا تھا جس میں انسان کی تمام تر کوششیں دھرتی کی زرخیزی کو برقرار رکھنے کے لئے وقف ہوگئیں۔ اس کے ساتھ سُورج دیوتا اور دھرتی دیوی کی پُوجا زور شور سے ہونے لگی۔ اِس دور کا انسان جنسی ملاپ کرنے اور ہل چلانے کے عمل کو یکساں ثمر آور خیال کرتا تھا کیوں کہ دونوں پیدائش اور افزائش کا باعث ہوتے ہیں چنانچہ جیسا کہ ہم دیکھ چُکے ہیں دھرتی کی بار آوری کو بحال رکھنے کے لئے دھرتی دیویوں کے معبدوں میں دیو داسیوں کے ساتھ جنسی ملاپ کرنے کی کامل آزادی تھی۔ اِس کے ساتھ ہی لِنگ اور یُونی کو پیدائش اور افزائش کے علامات سمجھ کر اُن کی پُوجا کرنے لگے۔ لِنگ یُونی کُنڈی کے مجسّمے معبدوں میں رکھے گئے۔

قدیم مصر میں انکھ (☥) لِنگ یُونی کے ملاپ کا نشان تھا۔ فراعین دربار میں دستہ دار صلیب ☥ اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے کیوں کہ یہ لِنگ یُونی کُنڈی کی علامت تھی۔ اِسے مبارک اور مُقدّس سمجھ کر لوگ اپنے گلے میں لٹکاتے تھے اور اِسے اقبال مندی اور خوشحالی کا سبب جانتے تھے۔ کہتے تھے کہ صلیب نظرِ بد سے محفوظ رکھتی ہے۔ بعد میں یہی نشان کلیسائے رُوم نے اپنا لیا۔

آج بھی کیتھولک اِسے گلے سے لٹکاتے ہیں اور قبروں پر نصب کرتے ہیں کہ اِس طرح مُردے کو حیاتِ ثانی پانے میں آسانی ہوگی۔ سواستکا (卐) یا ٹیڑھی صلیب بھی دراوڑوں ہی سے یادگار ہے۔ اِس کا نشان آج بھی کالی دیوی کے مندر کی دیواروں پر دکھائی دیتا ہے۔ بابل کے معبدوں میں مُقدّس کھمبا نصب کرتے تھے جسے اشیرا کہا جاتا تھا۔ اشیرا لنگ کی علامت تھا۔ نجران کے باشندے ایک کھجور کو لنگ کا نشان سمجھ کر اُس کی پوجا کرتے تھے۔ اِس کے گرد میلا لگتا تھا جس پر عورتیں مرد والہانہ گاتے بجاتے اور ناچتے تھے۔ اشیرا یا مُقدّس کھمبا کنعان، شام اور فلسطین کی دھرتی دیویوں کے معبدوں میں دکھائی دیتا تھا۔ روما میں سیتر نیلیا کے تہوار پر لنگ یونی کے مجسمے جلوس کی شکل میں لے کر چلتے تھے۔ بانجھ عورتیں حصولِ اولاد کے لئے پرائپس دیوتا کے لنگ پر بیٹھا کرتی تھیں۔

تہذیب و تمدّن کی ترقی کے ساتھ مصر، کالدیہ، فنیقیہ، یونان وغیرہ میں صدیاں گذریں لنگ پوجا دم توڑ چکی ہے لیکن ہندوستان میں آج بھی شیو مت، تنتر مت اور شکتی پوجا کی صورت میں لنگ یونی کی پوجا باقی و برقرار ہے۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے شیو اصلاً دراوڑی ہے جس کا مجسمہ ہڑپا کی کھدائی سے برآمد ہوا ہے۔ اِس میں شیو کو یوگیوں کے آسن سمادھی میں بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے۔ اِس کے قریب جانور کھڑے ہیں۔ ہندو مت میں بھی شیو کو پشوپتی (جانوروں کا آقا) اور مہا یوگی کہا جاتا ہے۔ شیو مت فی الاصل زرخیزی کا مت ہے جس میں دھرتی کی بار آوری کو برقرار رکھنے کے لئے اور عورتوں کے بانجھ پن کو دُور کرنے کے لئے شیو لنگ کی پوجا کی جاتی ہے۔ لنگ شیو کی اور یونی اُس کی شکتی کی علامت ہے جن کا ملاپ کنڈی میں دکھایا جاتا ہے۔ جے پور میں سنگِ مرمر کے تراشے ہوئے لنگ ہندوستان کے دُور دراز کے علاقوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ اِن مجسموں پر تیل گراتے رہتے ہیں۔ خاص تقاریب پر انہیں گنگا جل میں غسل دیا جاتا ہے۔ ان پر پھول پتے چڑھا کر اور اِن کے سامنے بخور

جلاکر ان کی پوجا کی جاتی ہے۔ رامیشورم کے لنگ پر ہر روز پانی لنڈھاتے ہیں۔ لوگ تبرکاً یہ پانی لے جاتے ہیں اور بانجھ عورتوں کو پلاتے ہیں۔ نیپال، بنارس اور جنوبی ہند کے مندروں کے در و دیوار پر میتھنا کے نقوش جنسی ملاپ کے مختلف آسنوں کی صورت میں کُھدے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ سڑکوں پر اور چوراہوں میں ہر کہیں لنگ یونی کُنڈی کے سنگیں مجسمے دکھائی دیتے ہیں۔ لوگ ان کی پوجا بھی کرتے ہیں اور ان پر ناریل بھی پھوڑتے رہتے ہیں۔

جنوبی ہند میں جہاں دراوڑوں نے آریا حملہ آوروں کے آگے آگے بھاگتے ہوئے پناہ لی تھی لنگ یونی کے لیے عظیم الشان معبد تعمیر کیے گئے جن میں آٹھ بہت مشہور ہیں۔ ایلورا کے غار میں جو سنگیں لنگ نصب ہے اُسے نہایت مقدس مانتے ہیں۔ بھوبانیشور میں سب سے عظیم مندر لنگ راج ہے۔ یہ منارہ سری مندر کہلاتا ہے۔ یہاں کے شیو لنگ کی پوجا نہایت ذوق و شوق سے کی جاتی ہے۔ کیلاش ناتھ اور کونارک کے معبدوں کے در و دیوار پر جنسی ملاپ کے وہ تمام آسن دکھائی دیتے ہیں جن کی تفصیل واتسیاین نے اپنی کتاب کام شاستر میں دی ہے۔ مدورائی کے مندر میں جو سنگیں لنگ نصب ہے اِس پر تیل اور سیندور گراتے رہتے ہیں جس سے اُن کا رنگ لال بھبھوکا ہو گیا ہے۔ لاہور کے عجائب گھر میں جو لنگ رکھا ہے اُس کے سرے پر شیو دیوتا کی شبیہ بھی تراشی گئی ہے۔

شیو بھگت اپنی پیشانیوں پر لنگ یونی کُنڈی کا نشان بطور تلک لگاتے ہیں۔ ان کے ہاں رواج ہے کہ دُلہن رخصت ہونے سے پہلے شیو لنگ پر بیٹھتی ہے تاکہ اُس کی کوکھ جلد ہری ہو جائے۔ شیو بھگتوں کا ایک فرقہ لنگ دھاری کہلاتا ہے۔ یہ لوگ لنگ کے ننھے منے مجسمے سونے چاندی میں منڈھوا کر برکت اور افزائش کے لیے گلے میں لٹکاتے ہیں۔ ہاتھ میں ترسُل (سہ شاخہ چھڑی) اُٹھائے پھرتے ہیں جو آلاتِ تناسل کی علامت ہے۔ لنگایت لنگ کو مجامعت برآر خیال کرتے ہیں، ذات پات کے منکر ہیں اور مُردے جلانے کے

بجائے دفن کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ لنگ تمام لوگوں کو مساوی پیدا کرتا ہے۔

شیو بھگتوں کے سوامی کی خدمت پر جوان عورتیں کمربستہ رہتی ہیں۔ یہ دیوداسیوں سے مختلف ہیں۔ شیو بھگت اپنے سوامی کے پیر دھو کر پیتے ہیں اور بعض جوشیلے عقیدت مند تو اُس کا بول بھی تبرک سمجھ کر پی جاتے ہیں۔ شیو بھگتوں کے برعکس وشنو فرقے کے نام دھاری (نام یا نم بہ معنی یونی) لنگ سے زیادہ یونی کی پوجا کرتے ہیں اور اُسے تمام تخلیق کا گہوارہ مانتے ہیں۔ شیو راتری کا تہوار ۱۴۔ ماگھ کو بڑے جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔ کئی پجاری سر کے بل چل کر شیو کی پوجا کے لئے آتے ہیں۔ کئی ہاتھوں کے بل چلتے ہوئے راستہ طے کرتے ہیں۔ بعض لوگ ڈنڈے کی طرح زمین پر لیٹ کر شیو لنگ کے مندر تک پہنچتے ہیں۔ اسے ڈنڈوت کہتے ہیں۔ شیو کے بیل نندی کے لئے جو جنسی توانائی کی علامت ہے مندر تعمیر کئے گئے ہیں جہاں اُس کا سنگیں مجسمہ تراش کر رکھتے ہیں۔ اس کے سامنے پجاری ماتھا ٹیکنے آتے ہیں۔

تنتر مت اور شکتی مت کا تعلق بھی زرخیزی کے مسلک سے ہے۔ تنتر مت والوں کے خیال میں کائنات اُس وقت وجود میں آئی جب شیو اور شکتی کا یا دوسرے الفاظ میں پُرش اور پرکرتی کا اختلاط ہوا تھا۔ آج کل اس خرافہ کی ترجمانی سائنس کے پیرائے میں کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ توانائی کے مادے میں نفوذ کر جانے سے کائنات بنی تھی۔ کہتے ہیں کہ مرد اور عورت کا جنسی ملاپ بھی اسی آفاقی ملاپ کی علامت ہے شکتی مت راتوں کو خفیہ مجالس میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ ان میں سب ذاتوں کے لوگ ہوتے ہیں۔ پہلے ایک جوان لڑکی کو کھڑا کر کے اُسے شکتی سمجھ کر پوجتے ہیں پھر عورتیں مرد بھنا ہوا گوشت اور مچھلی کھاتے ہیں، بے تحاشا شراب پیتے ہیں اور ساری رات انتہائی فسق و فجور میں گذارتے ہیں۔ سوامی دیانند نے شکتی پوجا کی تفصیل بڑے کٹیلے اور طنزیہ انداز میں لکھی ہے[1]۔

---

[1] ستیارتھ پرکاش

ناگ پُوجا

ناگ پُوجا بھی دراوڑی روایت ہے۔ پُرانے زمانے میں ناگ کو بقا اور حیات بعد موت کی علامت سمجھتے تھے کیوں کہ وہ کینچلی بدلتا رہتا ہے۔ فراعین مصر تاج پر ناگ کی شبیہ کا مُکٹ پہنتے تھے۔ ناگ لِنگ کی علامت بھی بن گیا جیسا کہ فرائڈ اور ژُنگ کا بھی ادعا ہے۔ بنو اسرائیل کے ہاں ناگ خرد و دانش کا نشان بھی تھا جس نے حوّا کو شجرِ ممنوعہ کا پھل کھانے کی ترغیب دی تھی۔ اُن کے خیال میں ممنوعہ پھل کھانا آدم اور حوّا کا جنسی مقاربت کرنا ہی تھا۔ بعد میں آگسٹائن ولی نے اس گناہ کی اساس پر باقاعدہ ایک فلسفہ تعمیر کر دیا اور کہا کہ آدم کا یہ گناہ بنی آدم کو ورثے میں ملتا ہے جس کی پاداش سے بچنے کے لئے مسیح منجی پر ایمان لانا ضروری ہے۔ یہودی ایک دوسرے کے آلات تناسل پر ہاتھ رکھ کر عہد و پیماں[1] کیا کرتے تھے۔ ہندوستان میں ہر سال ساون کے مہینے میں جب سانپ سے ڈسنے کا خطرہ سب سے زیادہ ہوتا ہے ناگ پنچمی کا تہوار مناتے ہیں، ناگ کے مجسّمے کی منڈھی بنا کر اُس کی پُوجا کرتے ہیں۔ اُن کے ہاں ناگ کو جان سے مارنا ممنوع ہے۔ عورتیں اُسے دودھ پلاتی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق دنیا شیش ناگ کے پھن پر کھڑی ہے۔ دوسری روایت میں ناگا لوگوں کا ذکر آیا ہے جن کی شکل و صورت انسانوں جیسی ہی ہوتی ہے لیکن جو آنکھیں نہ جھپک سکنے

---

[1] لفظ TESTIMONY مشتق ہے TESTES سے جس کا معنیٰ ہے خصیتین۔ مسلمان بھی اسی طریقے سے عہد و پیمان کیا کرتے تھے۔

سے پہچانے جاتے ہیں۔ مہابھارت میں لکھا ہے کہ ارجن نے ناگا قبیلے کی ایک عورت سے بیاہ کیا تھا جب ارجن کو اُس کے بیٹے ببروواھن نے قتل کر دیا تو اِس کی عورت نے ناگ منتر پڑھ کر اُسے زندہ کر دیا تھا۔ کشمیر قدیم تریں زمانوں سے ناگ پوجا کا مرکز رہا ہے۔ یونان قدیم میں بھی ناگ کے لئے مندر تعمیر کیا گیا تھا جہاں اُسے شہد کی ٹکیاں کھلائی جاتی تھیں۔

○

قربانی

رابرٹسن سمتھ کے خیال میں قربانی کی رسم قدیم مذہب کی اساس تھی۔ وہ کہتا ہے کہ قربانی وہ نذرانہ یا تحفہ تھا جو قدیم زمانے کے لوگ اُن دیوتاؤں اور دیویوں کو پیش کرتے تھے جو اُن کے عقیدے کے مطابق اُن کے مقدر پر تسلط رکھتے تھے۔ وہ قربانی دے کر اُن کی خوشنودی حاصل کیا کرتے تھے۔ لہو کو حیات اور توانائی کی علامت مانتے تھے چنانچہ نفس کا معنیٰ حیات بھی ہے اور لہو بھی جیسا کہ لفظ انفاس سے ظاہر ہے۔ چنانچہ لہو کا کھانا ممنوع ٹھہرا اور ذبیحہ کا رواج ہوا۔ ذبیحہ کا خون بتوں پر چھڑکتے تھے تاکہ دیوتاؤں کی توانائی بحال رہے۔ جسمانی اور اخلاقی پاکیزگی کے لیے بھی خون بہاتے تھے۔ کوئی شخص سائی بیلی دیوی کے مت میں داخل ہونا چاہتا تو ایک گڑھے میں ننگا بٹھا دیتے تھے پھر گڑھے کے کنارے بیل ذبح کرتے جس کا خون اُس شخص پر گرتا اور وہ پاک ہو جاتا۔ متھرا مت والے بھی خون سے بپتسمہ لیتے تھے۔ قول و قرار اور عہد و پیمان کے لیے ایک دوسرے کے بازو میں چرکا لگا کر لہو پینے کا رواج عام تھا۔ جادوگر ٹونے ٹوٹکے خون سے لکھتے رہے ہیں۔ ایک دفعہ شاہ قسطنطین بیمار پڑ گیا۔ مرض نے طول پکڑا تو ایک درباری نے مشورہ دیا کہ جہاں پناہ کسی کنواری لڑکی کے خون سے غسل کریں تو شفایاب ہو جائیں گے۔ ہنگری کی شہزادی باتھوری اپنے شباب کو بحال رکھنے کے لیے نوجوان لونڈیوں کے خون میں نہایا کرتی تھی۔

جنگ میں فتح حاصل کرنے، دفعِ بلیات، دھرتی کی بارآوری کو برقرار رکھنے، بارش برسانے، حصولِ اولاد کے لیے بھی خونی قربانی دی جاتی تھی۔ پہلے پہل نربلی (مرد کی قربانی) دینے کا رواج تھا،

پھر گھوڑوں، بیلوں، پھر بکریوں کی قربانیاں دینے لگے۔ قدیم یونان و روما میں لڑائی چھڑنے سے پہلے کسی کنواری لڑکی یا گھوڑے کی قربانی دی جاتی تھی۔ ہندوستان میں دھرتی کی زرخیزی میں اضافہ کرنے کے لئے سیاہ یا سفید گھوڑا قربان کیا کرتے تھے۔ رامائن میں سیاہ اور مہابھارت میں سفید گھوڑے کی قربانی کا ذکر آیا ہے۔ روما میں ڈیانہ دیوی کے معبد میں گھوڑا ذبح کیا جاتا تھا۔ ایران قدیم میں متھرا دیوتا کے لئے سانڈ کی قربانی دی جاتی تھی۔ رومی جرنیل، اپنی فتح کے جلوس کے بعد دیوتا مریخ کے معبد میں مفتوح سپہ سالار کو ذبح کرتے تھے۔ قرطاجنہ میں مصیبت کے دفعیے کے لئے دیوتا مولک پر ننھے منے بچے آگ کے شعلوں میں پھینک کر قربان کیا کرتے تھے۔ دھرتی کی زرخیزی کو بڑھانے کے لئے جنوبی ہند کے گونڈ اور ماریا قبائل فصلیں بوتے وقت ایک جوان لڑکی کی قربانی دیتے تھے۔ اس لڑکی کو کھمبے سے باندھ دیتے اور قبیلے کے افراد باری باری اُس پر خنجروں سے وار کرتے تھے۔ اُس کا بہتا ہوا خون کھیتوں میں چھڑکتے تھے۔ بعض وحشی قبائل میں یہ رواج تھا کہ سالانہ قربانی کے لئے ایک نوجوان کو منتخب کر لیا جاتا۔ سال بھر اُس کی خوب خاطر مدارت کرتے۔ حسین لڑکیاں اُس کا دل بہلاتیں اور اُسے اچھے اچھے کھانے کھلائے جاتے۔ سال کے خاتمے پر اُسے ذبح کر دیتے تھے۔ میکسیکو میں سورج دیوتا ہوئی پولوکتلی کی روشنی کو بحال رکھنے کے لئے ہر روز طلوع آفتاب کے وقت اُس کی قربان گاہ پر جنگی قیدی ذبح کئے جاتے تھے۔ پروہت پتھر کے خنجر سے ذبیحہ کا سینہ چاک کر کے اُس کا دھڑکتا ہوا دل سینے سے کھینچ لیتا اور ہاتھ بلند کر کے سورج دیوتا کو پیش کرتا تھا۔ ازتکوں کے دیوتا زائپ توٹک کے بُت کے سامنے آدمیوں کی زندہ کھال کھینچ کر قربانی دیتے تھے۔ قدیم فلسطین میں عام طور سے کوئی چٹان مذبحہ ہوتی تھی جس پر انسان ذبح کئے جاتے تھے بعد میں بکری کے بچوں کی قربانی دینے لگے۔ کنعان میں بچوں کی قربانی دے کر انہیں مرتبانوں میں بند کر کے دفن کر دیا کرتے تھے۔ ایسے کئی مرتبان کھنڈروں سے برآمد ہوئے ہیں۔ یہودی سوختنی قربانی میں ذبیحہ کی انتڑیوں کے ساتھ لگی ہوئی

چربی کو آگ پر رکھتے اور گوشت ربائی کھا جاتے تھے۔

ہندوستان میں کالی یا چنڈی دیوی کے بُت کے سامنے نر بلی (انسانی قربانی) دینے کا رواج تھا۔ آج کل کلکتہ میں اس کے معبد میں دو ڈھائی سو بکریاں ہر روز قربان کی جاتی ہیں۔ وندھیا چل میں مرزا پور کے قریب کالی کا ایک مندر ہے جہاں ٹھگ آدمی کی قربانی دیا کرتے تھے۔

فراعنۂ مصر کے دورِ حکومت میں ہر سال دریائے نیل میں بروقت طغیانی لانے کے لئے ایک حسین دوشیزہ کو دلہن بنا کر منجدھار میں ڈبو دیا کرتے تھے۔ آج کل فلاحین ان دنوں میں مٹی کی مورتی بنا کر ڈبوتے ہیں جسے عروسہ کہتے ہیں۔ کالدیہ اور اشوریا میں بعل مردوک کے مندروں کی قربان گاہیں انسانی خون سے سارا سال تر بتر رہتی تھیں۔ بعل کے بُت کے سامنے پہلوٹھی کے بچے ذبح کرتے تھے۔ یہودی اپنی فصلوں کے پہلے خوشے اور باغوں کا پہلا پھل معبد میں بھینٹ کرتے تھے۔ عرب اونٹ یا بکری کے پہلے بچے کو جسے فرع کہتے تھے اپنے بتوں کے سامنے ذبح کرتے تھے۔ اموری مقدس کھمبے پر جو لنگ کی علامت تھا پہلے بچے کی قربانی دیتے تھے۔ آگا میمنون شاہ سپارٹا نے سمندر کے دیوتا کو خوش کرنے کے لئے اپنی بیٹی آلفی جینیا کی قربانی دی تھی۔ یہودی سپہ سالار جفتہ نے اموینوں پر فتح پائی تو اس خوشی میں اپنی بیٹی قربان کی تھی۔ برطانیہ کے درویڈ صدیوں تک انسانی قربانی دیتے رہے۔ یہودیوں کی خطا کی قربانی کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ خطا کی اجتماعی قربانی دینے کے لئے وہ سال میں ایک مرتبہ ایک بکرا لاتے جسے عورتیں مرد بچے باری باری چومتے گویا اپنی خطائیں اُس میں منتقل کر رہے ہیں۔ پھر اس بکرے[۱] کو پہاڑ کی چوٹی سے دھکا دے کر کھڈ میں گرا دیتے تھے۔

فکر و نظر کی ارتقاء کے ساتھ انسان دوسروں کی قربانی دینے کے بجائے لذاتِ دُنیوی

[۱] SCAPE-GOAT

کی قربانی تجرد اور ریاضت کی صورت میں دینے لگا۔ راہب، جُتی، سنیاسی وغیرہ عمر بھر مُجرّد رہنے کا عہد کر لیتے تھے یہ اپنی ذات اور اپنے شباب کی قربانی تھی۔ یہ لوگ تیاگ اور تجرّد کی آگ میں جل جل کر بھسم ہوتے رہتے تھے۔ اس غیر فطری زندگی نے نہ صرف جنسی بے راہ روی کا باب کھول دیا بلکہ کئی تارک الدنیا ذہنی اعتدال سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ اپنے سلگتے ہوئے جنسی جذبے کو ٹھنڈا کرنے کے لیئے وہ لمبا اوقات اپنی پیٹھ پر خار دار کوڑے برسایا کرتے اور اپنے آپ کو لہولہان کر لیتے تھے۔ مسیحی "اولیاء" کے سوانح اس پہلو سے نہایت المناک اور عبرت آموز ہیں۔

کلیسیائے روم والوں کی سب سے بڑی قربانی کو عشائے ربانی کہتے ہیں۔ پال ولی نامہ کار تھیاں میں کہتا ہے۔

"مجھے یہ روایت خداوند مسیح سے ملی جسے میں تم سے بیان کرتا ہوں کہ خداوند یسوع نے اُس رات کو جس میں مخبری کی گئی روٹی لے کر ادائے شکریہ کے بعد توڑی اور کہا" لو اسے کھاؤ یہ میرا جسم ہے جو تمہارے واسطے توڑا گیا۔ بطور یادگار تم بھی ایسا کرنا" اسی طرح آپ نے پیالہ پیا اور اس میں تھوڑا پی کر فرمایا" یہ پیالہ میرے خون کا عہد جدید ہے جب کبھی تم پیو میری یاد میں ایسا ہی کرتے رہنا۔"

اس تقریب پر مسیحی روٹی کا ٹکڑا جناب مسیح کا بدن سمجھ کر کھاتے ہیں اور شراب اُن کا لہو سمجھ کر پیتے ہیں۔ اس رسم کی جڑیں قدیم ترین ٹوٹم مت تک جاتی ہیں جس میں لوگ اپنے ٹوٹم کو مل کر کھا جاتے تھے تاکہ اُس کی مانا یا طلسماتی توانائی اُن میں بھی سرایت کر جائے۔ بعض اہل تحقیق کے خیال میں یہ قربانی متھرامت سے لی گئی ہے جس میں روٹی کو متھرا کا بدن سمجھ کر کھاتے تھے اور پانی کو اُس کا لہو سمجھ کر پیا کرتے تھے تاکہ اُس کی برکت اُن میں بھی نفوذ کر جائے۔ متھرامت کی یہ رسم بھی ظاہراً ٹوٹم مت ہی سے ماخوذ ہے۔

کھانا پینا

انسان کے نیم حیوانی آباء شروع شروع میں درختوں پر بسیرا کرتے تھے اور ان کے پھل کھا کر پیٹ بھر لیتے تھے۔ جب پہلے برف کے زمانے میں پودوں اور پیڑوں پر برف کی چادر تن گئی تو انہوں نے بھٹوں اور کھوہوں میں پناہ لی اور پتھر کے بھالوں سے جانوروں کا شکار کرنے لگے۔ آگ کی دریافت کے ساتھ گوشت بھون کر کھانے لگے۔ انسانی تاریخ کے اس مرحلے پر "میں، تو" کا شعور پیدا نہیں ہوا تھا اس لئے وہ مل کر شکار کرتے اور ایک ہی جگہ بیٹھ کر گوشت کے ٹکڑے باری باری دانتوں سے کاٹ کر کھا لیتے۔ اس کے ساتھ خود رُو سبزیوں، پھلوں اور جڑی بوٹیوں کا استعمال بھی جاری رہا۔

زرعی انقلاب کے بعد فصلیں اُگانے کا رواج ہوا۔ عورتوں نے غلّے کو سل پر پیس کر آٹا بنایا اور روٹی پکانے کا طریقہ دریافت کیا جیسا کہ آج بھی پاوندوں کی عورتیں سلوں کو آگ پر تپا کر ان پر روٹی پکاتی ہیں۔ انسان نے اس دوران میں گائے بیل اور بھیڑ بکریوں کو سدھا لیا تھا۔ وہ ان کا دودھ پیتے، مکھن اور جغرات کھاتے اور ضرورت پڑنے پر ذبح کر کے ان کا گوشت بھی کھا لیتے تھے۔

جغرافیائی ماحول نے کھانے کے طریقوں اور خوراک میں تنوّع پیدا کیا۔ صحرائی اور کوہستانی بھیڑ بکریاں اور اونٹ پالتے تھے اور ان کا گوشت رغبت سے کھاتے تھے۔ زرخیز میدانی علاقوں میں جہاں غلّہ اور سبزیاں بافراط اُگتی ہیں لوگ زیادہ تر سبزی خوری کی طرف مائل ہو گئے۔ گرم مرطوب آب و ہوا میں گوشت اور چربی معدے پر گراں گذرتی ہے اس لئے گوشت کھانے کا رواج کم ہے اور فعل ہضم کو درست رکھنے کے لئے

گرم مصالحے اور تیز سُرخ مرچ کھاتے ہیں۔ دریاؤں اور سمندروں کے ساحلوں پر رہنے والے قدرتاً مچھلیاں شوق سے کھاتے ہیں۔ پہاڑی اور کوہستانی اکثر چلتے پھرتے رہتے ہیں اور زیادہ جفاکش ہوتے ہیں اس لئے وہ ثقیل غذائیں آسانی سے ہضم کر لیتے ہیں مثلاً ہمارے قبائلی علاقے میں بُھنا ہوا گوشت اور چربی عام غذا ہے۔ اس کے ساتھ وہ خشک میوے بادام، پستہ، کشمش وغیرہ ٹھونگتے رہتے ہیں جس سے اُن کے چہرے کا رنگ نکھرا رہتا ہے۔ جن ممالک کی آب و ہوا گرم ہے وہاں اچار چٹنیاں خوراک کے لازمی اجزا بن گئے ہیں کیوں کہ اِن کے بغیر کھانا بخوبی ہضم نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر ہند و پاک میں آم، شلجم، لیموں، کریلے، ڈیلے اور ہری مرچ کا اچار شوق سے کھاتے ہیں۔ سرد ممالک میں جہاں سال کا بیشتر حصہ جاڑے کا سماں رہتا ہے بدن کو گرم رکھنے کے لئے چربی والا گوشت کھاتے ہیں اور شراب پیتے ہیں جس سے وہ چاق و چوبند رہتے ہیں۔

تاریخ کے مطالعے سے یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے کہ تاریخ نام ہے جفاکش کوہستانیوں اور صحرائیوں کا میدانی علاقوں کے تن آسان لوگوں پر بار بار ترکتاز کرنے کا اور اُن پر فتح پا کر اپنی راجدھانیاں قائم کرنے کا۔ جب یہ حملہ آور مغلوب اقوام کے طور طریقے اپنا لیتے ہیں تو وہ بھی کمزور اور بے حوصلہ ہو جاتے ہیں۔ مفتوحین کی چٹ پٹی غذا انہیں کاہل بنا دیتی ہے۔

اقوامِ عالم کی بنیادی خوراک گندم، جَو، چاول، مکئی، باجرے اور چنے پر مشتمل رہی ہے۔ گندم اُگانے کا راز سب سے پہلے عورت نے عراق میں دریافت کیا جہاں سے یہ پودا وسطی ایشیا، شمالی افریقہ اور یورپ کو پہنچا۔ باغِ عدن کی روایت دو آبۂ دجلہ و فرات ہی سے وابستہ ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ دانۂ گندم ہی شجرِ ممنوعہ تھا۔ گندم کی فطیری اور خمیری روٹی اکثر اقوام کی مرغوب غذا ہے۔ ہمارے ہاں گندم کی سادہ روٹی تکلفات کے ساتھ پھلکا (پھولا ہوا) نان، کلچا، پوری، پراٹھا، باقر خانی اور شیرمال بن گئی۔ میدے، سوجی،

سمنک اور نشاستے سے قسم قسم کی مٹھائیاں اور حلوے بنائے گئے جن میں گھی اور مکھن ملایا جاتا ہے۔ سوہن حلوہ، حبشی حلوہ، باگی حلوہ (کالا باغ کا مشہور ہے) سب لوگ مزے سے کھاتے ہیں۔ ان میں خشک میوے ملا کر زیادہ لذیذ اور مُقوّی بنا لیتے ہیں۔ مغرب میں انڈے، مکھن اور خشک میوے ملا کر رنگ برنگ کے حلوے بنائے جاتے ہیں۔

ریگستانی علاقوں میں جَو کے ستّو شہد اور گھی ملا کر کھاتے ہیں۔ عربوں کی غذا میں بھُنا ہوا گوشت، کھجوریں، شرید (شوربے میں بھگوئے ہوئے روٹی کے ٹکڑے)، خبیص (چھوہارے گھی میں کوٹ کر ملیدہ بنایا ہوا)، اونٹنی اور بکری کا دُودھ شامل تھا۔ بغیر چھنے ہوئے آٹے کی روٹیاں روغن زیتون کے ساتھ کھاتے تھے۔ غریب لوگ جَو کی روٹی سے پیٹ بھر لیتے۔

چاول وادیٔ سندھ سے جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک کو گیا۔ دنیا میں سب سے پہلے اسی وادی میں چاول کی کاشت کی گئی تھی۔ ہڑپا اور موئن جو دڑو کے کھنڈروں سے چاول کے دانے دستیاب ہوئے ہیں۔ چین، جاپان، کوریا، انڈونیشیا، ملایا، سیام، بنگال وغیرہ میں چاول ہی لوگوں کی بنیادی غذا ہے جسے عام طور سے مچھلی کے ساتھ کھاتے ہیں۔ چاول کی کئی قسمیں ہیں جن میں باڑا اور باسمتی نہایت عمدہ ہیں۔

ایران، ترکستان، ازبکستان اور خراسان میں چاول میں بھیڑ بکری اور مرغے کا گوشت ملا کر پکانے کا رواج ہوا جسے پلاؤ کہا جاتا ہے اور جو دُنیا کے لذیذ ترین کھانوں میں سے ایک ہے۔ کسی دوسرے کھانے کے ساتھ سادہ چاول پکا کر کھایا جائے تو اسے چلاؤ کہتے ہیں۔ پلاؤ کو کئی طریقوں سے پُر لطف بنایا گیا۔ ایران میں قسم قسم کے پلاؤ دم کرنے لگے۔ دلّی اور لکھنؤ میں پلاؤ پکانے کے نئے نئے طریقے ایجاد کیے گئے اور ان کے دلچسپ نام رکھے گئے۔ قورما پلاؤ میں گوشت کے ٹکڑے ملا کر دَم کرتے ہیں: اس میں زعفران کی آمیزش کر کے مزعفر کا نام دیا جاتا ہے۔ ششش رنگ پلاؤ میں چھ رنگ دیتے ہیں، دم پخت

مکھن ملا کر پکایا جاتا ہے۔ متنجن بھون کر پکاتے ہیں۔ امرائے دلی بریانی پسند کرتے تھے جس میں گوشت بھون کر ملایا[1] جاتا تھا۔ لکھنوی پلاؤ کے شیدائی تھے۔ ان کے ہاں کوکو پلاؤ، موتی پلاؤ، چنبیلی پلاؤ، نور پلاؤ، گلزار پلاؤ، انار دانہ پلاؤ، نورتن پلاؤ اہتمام سے دم کئے جاتے تھے[2]۔ ایرانی نارنجی پلاؤ (اس میں نارنگی کے چھلکوں کا ذائقہ اور خوشبو ملاتے ہیں) اور بابونی پلاؤ کے شوقین رہے ہیں۔ نمکین پلاؤ میں پیاز کا گاڑھا رنگ دیا جاتا ہے اور گرم مصالحوں کی چاشنی دی جاتی ہے۔ میٹھے چاول عام طور سے زردہ اور سفیدہ کی صورت میں پکاتے ہیں جن میں بادام، پستہ، گری کھوپا اور سبز الائچی ملاتے ہیں۔ نوابانِ لکھنؤ پلاؤ میں زیادہ گھی اور یخنی ملوایا کرتے تھے۔ ایک روایت ہے کہ نواب غازی الدین حیدر کے لئے چوبیس سیر یخنی میں ایک سیر چاول دم کئے جاتے تھے[2]۔ ایشیائی روس میں کرغیز یا قفقاز اور گرجستان میں نہایت مزیدار پلاؤ پکاتے ہیں جسے شاشلیک کباب کے ساتھ کھاتے ہیں۔

گوشت انسان کی اولین غذاؤں میں سے ایک ہے۔ اس کی دو معروف قسمیں ہیں ہُرخ اور سفید۔ گائے، بیل، بکرے، دُنبے، بھیڑ کا گوشت سُرخ کہلاتا ہے۔ سفید گوشت مرغے، تیتر وغیرہ پرندوں کا ہوتا ہے جو زیادہ زودِ ہضم اور مُقوّی ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل پر اونٹ کا گوشت حرام کر دیا گیا تھا جب کہ مسلمانوں پر حلال ہے۔ مسلمان ذبیحہ کا گوشت کھاتے ہیں جب کہ سکھوں اور عیسائیوں پر ذبیحہ کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ آج کل بڑے بڑے شہروں میں ملکوں کے مذبحے بنا دیئے گئے ہیں۔ صبحِ تاریخ سے بھُنا ہوا گوشت انسان کی مرغوب غذا رہا ہے۔ بسا اوقات سالم بیل، دُنبے، بکرے، گورخر اور ہرن سلاخوں میں پرو کر اور دہکتے ہوئے کوئلوں پر اُلٹ پلٹ کر خستہ کر لیتے تھے۔ ہمارے ہاں بھُنے ہوئے گوشت کو چٹ پٹا بنانے کے لئے گرم مصالحے ملائے جاتے ہیں۔ شوربا اور یخنی بھی شوق سے پیتے ہیں۔ قیمہ بنانے کا رواج ہوا تو طرح طرح کے کباب

---

[1] [2] یادِ ایّام۔ عبدالرزاق کانپوری، گذشتہ لکھنؤ عبدالحلیم شرر

بننے لگے، شامی کباب، چپل کباب، سیخ کباب، شِشلیک۔ برصغیر اور وسط ایشیا میں مزے لے لے کر کھاتے ہیں۔ قیمے سے کوفتے بناتے ہیں اور سموسے میں قیمہ بھرتے ہیں۔ دو پیازہ مغلیہ عہد کا معروف سالن تھا۔ اس میں دگنی پیاز کی چاشنی دیتے تھے جس سے شوربا زیادہ گھنا اور لذیذ ہو جاتا تھا۔ برصغیر ہندو پاک میں گرم مصالحے، موٹی الائچی، زیرہ، دارچینی، لونگ، سیاہ مرچ کا استعمال کثرت سے کیا جاتا ہے۔ ایک زمانے میں گرم مصالحوں کی تجارت زوروں پر تھی۔ ہندوستان، ملایا، جزائر شرق الہند سے گرم مصالحے مغربی ممالک کو برآمد کئے جاتے تھے۔ ولندیزوں اور پرتگیزوں نے اس تجارت سے بڑی کمائی کی۔

برہمن گوشت اور انڈا نہیں کھاتے حتیٰ کہ شلجم سے بھی پرہیز کرتے ہیں کہ اس کا رنگ گوشت جیسا ہوتا ہے۔ برہمن کہتے ہیں کہ گوشت کھانے کی ہوس غلبہ کرے تو کھانڈ کی بھیڑ بکریاں بنا کر کھانا چاہیے۔ انہیں کھانڈ کے کھلونے کہتے ہیں۔ سنیاسی، جتی اور بیوہ عورت کے لئے رات کا کھانا ممنوع ہے۔ بعض ہندو عہد کر لیتے ہیں کہ سوائے اُس غلّے کے جو گائے کے گوبر سے برآمد ہو کچھ نہیں کھائیں گے اور گئو موتر کے سوا کچھ نہیں پئیں گے چنانچہ صبح سویرے جب ڈھور ڈنگر چراگاہ کو جاتے ہیں تو یہ لوگ گڑویاں تھامے اس قیمتی مشروب کو اکٹھا کرنے کے لئے گئوؤں کے پیچھے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ البیرونی نے حیرت کا اظہار کیا ہے کہ ہندو گائے کا گوشت نہیں کھاتے لیکن اُس کا بول پی لیتے ہیں۔[1] اُن کا ایک ماہ کا برت چندراین کہلاتا ہے۔ چاند کی کلا کے گھٹنے بڑھنے کے مطابق ایک ایک لقمہ بڑھاتے یا گھٹاتے جاتے ہیں۔

ہندوؤں کے برعکس بودھ شروع سے گوشت کھاتے رہے ہیں۔ خود گوتم بدھ کی موت سؤر کا گوشت زیادہ مقدار میں کھا لینے سے ہوئی تھی۔ جب انسان برتن بنانے کے ہنر سے ناواقف تھا تو وہ درختوں کے چوڑے پتوں پر رکھ کر کھاتا ہوگا جیسا کہ آج بھی ہندو ڈھاک، بڑ یا کیلے کے پتوں پر چاٹ یا آلو دا

---

[1] ۔ کتاب الہند

کی بھجیا رکھ کر کھاتے ہیں۔ دہی وغیرہ کے لئے پتوں کا دونا بنا لیا جاتا ہے۔ چاک کی ایجاد کی گئی تو مٹی کی رکابیاں، قاب، صحنکیں، آبخورے، ڈونگے وغیرہ بننے لگے۔ آگ میں پکائے ہوئے مٹی کے یہ برتن پرانے شہروں کے کھنڈروں سے ملے ہیں۔ بعد میں کانسی، پیتل اور تانبے کے برتن بنانے لگے۔ بادشاہوں اور اُمراء نے سونے چاندی کے برتن بنوالئے۔ چین میں سفال سازی کی صنعت نقطۂ عروج کو پہنچ گئی۔ چینیوں نے عمدہ قسم کی سفید مٹی سے خوبصورت برتن بنائے اور ان پر پھول بوٹوں سے گل کاری کی۔ یہ نازک برتن آج بھی حیرت اور تحسین کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ سُونگ خاندان کے بادشاہوں کے زمانے کے نفیس برتن دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے انہیں پیاز کے چھلکے یا انڈے کے خول سے بنایا گیا ہے۔ یونانیوں، ساسانیوں اور مسلمانوں کی سفال سازی اور کوفت گری کے نہایت حسین نمونے مغرب کے عجائب گھروں میں آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ یورپ کے سلاطین اور اُمراء برتنوں پر اپنا خانوادگی نشان نقش کروایا کرتے تھے۔

بادشاہ اور اُمراء ضیافتوں میں بڑے تکلفات سے کام لیتے تھے۔ ابن بطوطہ اصفہانیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ایک امیر نے اپنے مہمان کو جو کھانا کھلایا وہ شمعوں کی آگ پر پکایا گیا تھا۔ جوابی دعوت میں اُس کے دوست نے ریشم کی آگ پر کھانے پکوائے۔ روما کی شاہی ضیافتوں میں دوسرے پُرتکلف کھانوں کے ساتھ فاختاؤں کے دلوں اور بلبلوں کی زبانوں کے کھانے پیش کئے جاتے تھے۔ بادشاہوں اور اُمراء کے مطبخ پر بے تحاشا خرچ کیا جاتا تھا مثلاً بنو عباس کے ایک وزیر ابن الفرات کے مطبخ میں ہر روز نوّے بھیڑیں، تیس بکریاں، دو سُو مرغ، دو سُو تیتر اور کبوتر صرف ہوتے تھے۔ نواب شجاع الدولہ والئ اودھ کے چار باورچی خانے تھے جن کا ماہوار خرچ اُنہتر ہزار آٹھ سُو تیئس روپے اُٹھتا تھا۔ خوان مہریاں لاتی تھیں۔ یہ لکڑی کے ہوتے جن کے اوپر تیلیوں کا گنبد نما چھابا ہوتا تھا۔ اِس کے اوپر سفید لٹھے کا کپڑا منڈھا ہوتا تھا جن کے اوپر خاصہ دار یا بکاول کی مُہر ہوتی تھی۔ اُمراء ایک دوسرے کو ایک سو ایک خوان سے کم نہیں بھیجتے تھے۔

لکھنؤ میں بارہ قسموں کے کھانوں کے مجموعے کا نام توڑا تھا۔ ایک توڑے میں لازمی طور پر حسب ذیل کھانے ہوتے تھے: پلاؤ، مزعفر، متنجن، شیرمال، سفیدہ، بورانی، قورما، گوشت میں تلی ہوئی اروییاں، شامی کباب، مربّے، چٹنیاں۔

خلفائے بنو عباس کے دسترخوان بڑے وسیع ہوتے تھے جن میں بیسیوں مہمان ہر روز شرکت کرتے تھے۔ مختلف کھانے نہایت سلیقے اور ترتیب کے ساتھ مہمانوں کے سامنے لائے جاتے تھے۔ کُتب تواریخ میں لکھا ہے کہ ہارون الرشید کے دسترخوان پر عموماً تیس کھانے چُنے جاتے تھے۔ سب سے پہلے شوربا (ایرانی سکباج) پھر سبزی ترکاری، مرغ اور پرندوں کا گوشت، بھُنا ہوا گوشت، مچھلیاں، مصالحے دار گوشت، خمیری روٹی، نیم برشت انڈے، اُبلی ہوئی سبزیاں، چوزوں کا گوشت، البتہ (بھات ہندوستان سے لیا گیا تھا)، حلوے، لوزیات، موسم گرما میں فالودہ، پھل انگور، سیب، ناشپاتی، خشک میوے، سنبوسہ (سموسہ سندھ سے لیا گیا تھا) اور آخر میں نُقل کی کشتی یعنی گرم غذاؤں کے بعد سرد غذائیں آتی تھیں۔ کھانے کے دوران غلام قم قم سے گلاب پاشی کرتے رہتے تھے۔ ابریق اور طشت سے ہاتھ دُھلائے جاتے تھے اور چاندی کی چھوٹی انگیٹھیوں میں بخور جلا کر مہمانوں کی داڑھیاں اور گریبان خوشبو میں بسائے جاتے تھے جیسا کہ خلیجی ریاستوں میں آج کل بھی رواج ہے۔ دسترخوان پر دوستانہ بذلہ سنجی کو مہمان نوازی کا لازمہ سمجھا جاتا تھا۔

ہندوؤں میں ضیافت کی روایت نہ ہونے کے برابر ہے۔ سب لوگ الگ الگ بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ گھر والی کٹوریوں میں بھجیا، بھُنی ہوئی دال، سبزی، اچار، پھُلکے گھی سے چپڑے ہوئے، چٹنی ایک تھال میں رکھ کر سب کو تھما دیتی ہے۔ ہندو قدیم مصریوں کی طرح مٹی کے باسنوں میں کھانا نہیں کھاتے۔ پانی کے لئے بھی پیتل کے کٹورے اور گاگریں استعمال کرتے ہیں۔ مسلمان اکیلا ہو تو دسترخوان پر بیٹھ کر کھاتا ہے۔

عربوں کا سفری (چمڑے کا دسترخوان جس میں سفر کے لئے کھانا لپیٹ کر لے جاتے تھے) چوکی اور سینیہ پر مشتمل ہوتا ہے سینیہ پر کھانا چُن کر چوکی کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ کھانے کے بعد آفتابہ اور سلفچی (اصل چلچی جو تاتاری زبان کا لفظ ہے) سے ہاتھ دُھلاتے ہیں۔ پھر کھانے والا کُلی کر کے خلال کرتا ہے۔ پُرانے وقتوں کے لوگ چاندی کا خلال اور کان صاف کرنے کی تیلی دھاگے میں پرو کر گلے میں لٹکا لیتے تھے۔ اب یہ رواج باقی نہیں رہا۔ مل بیٹھ کر کھائیں تو چند آداب کا لحاظ رکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے مثلاً کھاتے وقت چپڑ چپڑ کی آواز نہ آئے۔ حریصانہ انداز میں کھانے میں ہاتھ نہ ڈالے جائیں کسی کی رکابی سے کوئی چیز نہ لی جائے۔ جب تک ایک لقمہ کھا نہ لیا جائے دوسرا منہ میں نہ ڈالا جائے، زیادہ نہ کھایا جائے۔

مغربی ممالک میں میز پر کھانے چُن دیئے جاتے ہیں اور سب لوگ چھری کانٹے سے کھاتے ہیں۔ چھری کانٹے سے کھانے کا رواج وسطی زمانے کے یورپ میں ہوا۔ وینس کے ایک حاکم ڈوگے کی بیوی دومی نیکو سلویا نہایت نازک مزاج تھی۔ کھاتے وقت شوربے سے انگلیاں لتھڑنا یا ہاتھ سے گوشت کے قتلے اُٹھانا اُسے ناگوار گزرتا تھا۔ یہ دیکھ کر اُس کے شوہر نے اُس کے لئے سونے کا ایک کانٹا بنوا دیا جس سے وہ کھانے میں کام لینے لگی۔ بعد میں فرانس کے امیر مونتا سیر نے کانٹے پر چھری کا اضافہ کیا اور یہ طریقہ مغرب میں ہر کہیں پھیل گیا۔ چینی اور جاپانی بانس کی کھپچیوں سے چاول کھاتے ہیں۔

کھانے سے پہلے دُعا مانگنے کی روایت مصری ہے۔ قدیم مصری مہمانوں کو کنول کے پھول پیش کرتے تھے۔ کھانے کے دوران میں ایک غلام لکڑی سے تراشی ہوئی ایک چھوٹی سی ممّی باری باری مہمانوں کو دکھاتا اور کہتا جاتا "اِسے دیکھو! موت کے بعد سب کی یہی حالت ہو گی اِس لئے کھاؤ پیو مزے کرو"۔ قدیم مصری پاؤں سے آٹا گوندھتے تھے جیسا کہ آج کل ہمارے بعض بیکری والے گوندھتے ہیں۔ قدیم بابلی مچھلی بہت کھاتے تھے۔ وہ مچھلیوں کو دھوپ میں سُکھا لیتے پھر اُنہیں کوٹ چھان کر آٹا بنا لیتے اور

اس کی ٹکیاں تل تل کے کھاتے تھے۔ راجپوت کھانا کھانے سے پہلے اناج کے کچھ دانے ان دیو (اناج کا دیوتا) کی بھینٹ کرتے تھے جیسا کہ ٹاڈ نے لکھا ہے[1]۔ پنجاب میں نئے مکان میں منتقل ہو کر برادری کی دعوت کرتے ہیں جسے چَٹھ کہتے ہیں۔

کھانے کے ساتھ قدیم زمانے کے کچھ توہمات اور ٹونے ٹوٹکے وابستہ رہے ہیں جن کے مآخذ ماضی بعید کے دھندلکوں میں گم ہو چکے ہیں مثلاً ایک توہم یہ ہے کہ کسی غیر کے سامنے کھانا کھانے سے نظر بد کا اندیشہ لاحق رہتا ہے اس لئے کوئی شخص آجائے تو اسے کھانے میں شریک کر لیا جاتا ہے۔ صوبہ سرحد اور پنجاب میں عورتیں کہتی ہیں کہ جو لڑکی کھانے کی رکابی یا ہنڈیا چاٹتی ہے اُس کے بیاہ پر آندھی آتی ہے۔ میکاڈو شاہ جاپان جن کے برتنوں میں ایک مرتبہ کھانا کھائے انہیں تلف کر دیا جاتا ہے۔ قدامت پسند ہندو سورج گرہن کے وقت کچھ نہیں کھاتے نہ عورتیں مربّہ اور اچار ڈالتی ہیں۔ انگریز عورتیں اس موقعہ پر کیک نہیں پکاتیں۔ قدیم مصری پروہت مچھلی، بھیڑ کا گوشت، خنزیر کا گوشت، لہسن، پیاز، لوبیا، مٹر نہیں کھاتے تھے۔ فیثاغورس اور اُس کے پیرو لوبیا اور سفید مرغے کا گوشت کھانے سے پرہیز کرتے تھے۔ کتے کا گوشت مسلمانوں اور یہودیوں میں حرام ہے لیکن کوریا، آسام اور برما میں کھاتے ہیں۔ یہودی اور مسلمان خنزیر کا گوشت حرام سمجھتے ہیں لیکن عیسائی بلا تکلف کھاتے ہیں۔ ہندوستان کے خانہ بدوش گگڑے، گلیلے، سانسی، بھینا وغیرہ سانڈا اور بلا تک کھا جاتے ہیں۔ چین کے ساحلی علاقوں میں مچھلی کے علاوہ مینڈک، کیکڑے اور کچھوے بھی کھاتے ہیں۔ اسلام سے پہلے کے عرب سوسمار کھایا کرتے تھے جیسا کہ فردوسی نے شاہنامہ میں طنزیہ کہا ہے۔ آج کل ہندو گائے کا گوشت نہیں کھاتے لیکن قدیم زمانے میں بیاہ کی تقریب پر گائے ذبح کی جاتی تھی اور اُس کا گوشت مہمانوں کو کھلایا جاتا تھا جیسا کہ بیجن ولکیہ کے سوانح میں لکھا ہے۔

---

[1] راجستھان

قدیم آریا قربانی کے گھوڑے کا گوشت کھاتے تھے۔ جاپانی سانپ کے گوشت کے کباب مزے لے لے کر کھاتے ہیں۔ ہوٹلوں میں اس کا شوربا بہت مہنگا بکتا ہے۔

عرب مفت خوروں کو طفیلیہ کہتے تھے۔ کوفہ میں ایک شخص طفیل نامی رہتا تھا جو کسی نہ کسی بہانے دعوتوں میں شریک ہو جاتا تھا۔ اُسی کے نام پر مفت خوروں کو طفیل خوار یا طفیلیہ کہنے لگے۔ مقاماتِ حریری کا مرکزی کردار ایک طفیلی ہی تھا۔ کسی دانا نے کہا ہے کہ آدمی زندہ رہنے کے لئے کھاتا ہے کھانے کے لئے زندہ نہیں رہتا لیکن پیٹو اور پُرخور اس بات کے قائل نہیں ہیں اور بے تحاشا کھاتے ہیں۔ برہمن اور مُلّا پُرخوری کے لئے بدنام ہیں۔ تاریخِ اسلام میں دو پیٹو خاصے مشہور ہیں۔ سلیمان بن عبدالملک اُموی اور ابوالفضل علامی۔ ایک دعوت میں سلیمان بن عبدالملک ایک سالم دُنبہ، چھ مُرغیاں، بیس چپاتیاں اور ایک سَو ستّر انار کھا گیا تھا۔ اُسے گُردے بہت مرغوب تھے۔ دسترخوان پر گرم گرم گُردوں کا قاب آتا تو وہ بلا تامّل آستین سے گُردے پکڑ پکڑ کر مُنہ میں ڈال لیتا تھا۔ ایک دفعہ وہ چوراسی دُنبوں کے گُردے کھا گیا۔ ابوالفضل علامیؔ ہر روز بائیس سیر ٹھوس غذا کھایا کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ پیٹو کا دماغ گدلا ہو جاتا ہے۔ اُس کا پیٹ بھر جاتا ہے لیکن دماغ خالی رہتا ہے۔ ابوالفضل نے اس کہاوت کو غلط ثابت کیا۔ یہ طے ہے کہ اُس جیسا ذہین اور طباع خاکِ ہند سے دوسرا کوئی نہیں اُٹھا۔ ○

چائے، کافی

چین میں قدیم زمانے سے ناشتے کے ساتھ چائے پی جاتی تھی۔ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہل کار سترھویں صدی کے اوائل میں چائے کو مغربی ممالک میں لائے۔ اِس سے پہلے اہلِ مغرب ناشتے میں بیئر یا چاکولیٹ پیا کرتے تھے۔ ۱۶۷۵ء میں چائے پینے کا رواج انگلستان بھر میں ہو گیا۔ چین میں چا اُس پانی کو کہتے ہیں جس میں پتیاں اُبالی جاتی ہیں۔ مغرب میں پتیوں کو چائے کہنے لگے۔ آج کل دنیا بھر کی اقوام میں مہمانوں کی تواضع چائے سے کی جاتی ہے۔ چائے کے ساتھ نان خطائی، کیک، بسکٹ اور مٹھائیاں پیش کی جاتی ہیں۔ چین اور جاپان میں چائے بغیر شکر اور دودھ کے پی جاتی ہے۔ اس میں دودھ اور شکر ملانے کا رواج ہندوستان میں ہوا جس میں یہ مشروب باقاعدہ ایک غذا بن گیا۔ چین میں چائے دم کرنے اور پینے کے برتن نہایت خوبصورت اور منقش بنائے جاتے تھے۔ اب یہ صنعت ہر کہیں قائم ہو گئی ہے۔ ہمارے ہاں سبز چائے کشمیر اور صوبۂ سرحد میں شوق سے پی جاتی ہے۔ سبز چائے سبز الائچی ڈال کر دم کرتے ہیں جس سے اِس میں لطیف مہک پیدا ہو جاتی ہے۔ جاپان میں چائے دم کرنے اور پینے کے پیچیدہ آداب مروّج ہیں جن سے گیشا لڑکیاں بخوبی واقف ہوتی ہیں۔

کافی کا نام حبشہ کے ایک صوبے کافا سے لیا گیا۔ شیخ الشاذلی ۱۲۳۹ء میں اسے موکھا (یمن) لائے جہاں اسے قہوہ کا نام دیا گیا۔ عربی زبان میں قہوہ پرانی شراب کو کہتے ہیں۔ سولھویں صدی میں شراب کی جگہ قہوہ پینے کا رواج ہوا۔ آج کل آخرِ شب شراب کا نشہ اُتارنے

کے لئے اہلِ مغرب کافی پیتے ہیں۔ برازیل دنیا بھر کو کافی فراہم کرتا ہے۔ کافی پینے کے لئے خاص وضع کی پیالیاں ہوتی ہیں۔ جنہیں عربی میں فنجان کہتے ہیں۔ ◎

پان

سنسکرت میں لفظ پان کا معنیٰ ہے پتّہ۔ پان پر چُونا، کتھا لگا کر سپاری کے ٹکڑے سے لپیٹ کر کھاتے ہیں۔ پان کھانے کا رواج ہندوستان اور جنوب مشرقی ایشیائی ممالک میں پُرانے وقتوں سے چلا آرہا ہے۔ سندھ کے طبیب اِسے دربارِ بنو عباس میں لے گئے جہاں اس میں لونگ کا اضافہ کیا گیا۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں نے زردہ ــــ سفوف تمباکو جسے سُنہرے رنگ کا ہونے کے باعث زردہ کہتے ہیں ــــ ملانا شروع کیا۔ ابن بطوطہ نے پان کے خواص کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔[1]

"پان کی خاصیت یہ ہے کہ مُنہ کو خوشبو دار بناتا ہے۔ بدبُو کو دُور کرتا ہے، کھانا ہضم کرتا ہے، نہار مُنہ پانی پینے کے ضرر سے محفوظ رکھتا ہے۔ اِسے کھانے سے فرحت ہوتی ہے اور مباشرت کے معاملے میں تقویّت پہنچاتا ہے۔"

راجپوتوں کا دستور تھا کہ جب کوئی خطرناک مُہم درپیش ہوتی تو راجہ سرِ دربار پان کا ایک بیڑا رکھوا دیتا اور کہتا تھا "کون اِسے اُٹھائے گا"۔ جب کوئی جیالا آگے بڑھ کر یہ بیڑا اُٹھا لیتا تو یہ مہم اُس کے نام ہو جاتی تھی۔ "بیڑا اُٹھانا" اِسی رسم سے یادگار ہے۔ ہمارے ہاں دعوت کے خاتمے پر پان اور سگریٹ سے مہمانوں کی تواضع کی جاتی ہے۔ لوگ کلّے میں گلوری دبا کر مُنہ چلاتے رہتے ہیں اور جا بے جا در و دیوار پر گل کاری کرتے رہتے ہیں۔

---

[1] عجائب الاسفار

تمباکو

تمباکو نئی دنیا کا پودا تھا جسے ہسپانوی اپنے ساتھ یورپ لائے اور پھر ولندیزی اور پرتگیز تاجروں نے اِسے ہندوستان اور ایران پہنچایا۔ امریکہ کے لال ہندی اُس پائپ کو ٹوبیکو کہتے تھے جس میں پتیاں سُلگا کر کش لیتے تھے۔ یورپ والوں نے پتّی کو ٹوبیکو کا نام دیا جو ہمارے یہاں تمباکو بن گیا۔ چائے کی طرح تمباکو بھی دُنیا بھر کے ممالک میں پیا جاتا ہے البتّہ اِسے پینے کے طریقے مختلف ہیں۔ اہلِ مغرب سگریٹ، سگار اور پائپ پیتے ہیں جب کہ مشرقی ممالک میں حُقّہ پینے کا رواج ہے۔ لفظ حُقّہ کا معنیٰ فارسی میں ہے گولہ۔ حُقّہ باز مداری کو کہتے ہیں جو گولے اُچھال اُچھال کر تماشا دکھاتا ہے۔ تمباکو پینے کا حُقّہ بھی گولے کی شکل کا ہوتا ہے۔ اِس کے کئی نام اور قسمیں ہیں۔ نارجیلہ (ناریل کا حُقّہ) پیچواں، فرشی، گڑگڑی، چموڑا (چمڑے کا) جو پنجاب میں پیتے ہیں، شیشہ (کانچ کا حُقّہ) جو عرب ممالک میں مقبول ہے، چبوک ترکیہ میں پیتے ہیں عرب اِسے شبوک کہتے ہیں۔ ایران میں قلیان پیتے ہیں۔ حُقّے میں پانی ڈالتے ہیں۔ اِس میں نڑی نیچا کس دیا جاتا ہے۔ مٹّی کی ٹوپی میں روڑ رکھ کر اُس پر گڑ، تمباکو رکھتے ہیں اور پھر انگارے بھر دیتے ہیں اور کش لگاتے ہیں۔ انگارے لبا اوقات پاتھک دشتی کے سُلگائے جاتے ہیں۔ بعض اوقات حُقّہ ایک ہی ہوتا ہے، کئی آدمی اُس کے گِرد دائرہ بنا کر بیٹھ جاتے ہیں اور باری باری کش لیتے ہیں۔ تمباکو جتنا کڑوا ہو اتنا ہی پسند کیا جاتا ہے۔ دیہات میں تمباکو کے پتے پیسٹ کر اُن کے بیڑے کس لیتے ہیں۔ کہتے ہیں تمباکو کا کش لینے سے ہلکا سا نشہ محسوس ہوتا ہے۔

نشہ باز تمباکو میں چرس ملا کر پیتے ہیں۔ اعلیٰ قسم کے ولایتی سگرٹوں اور سگاروں میں افیون یا شراب کی لاگ دی جاتی ہے اور خوشبو بھی ملائی جاتی ہے۔ شمالی پنجاب اور سرحدی علاقے میں تمباکو میں کرائس کے سفوف میں خوشبو ملا کر نسوار تیار کی جاتی ہے جو دانتوں پر ملتے ہیں یا ناس لیتے ہیں۔ فرانسیسی زبان میں تمباکو کے لئے نکوٹ کا لفظ ہے جو تمباکو کے زہر نکوٹین کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ آئے دن ڈاکٹر اس کی مضرت کی طرف اشارے کرتے رہتے ہیں لیکن تمباکو نوشی فیشن میں داخل ہے۔ ہر سال اربوں روپے تمباکو کے دھوئیں میں اڑا دیئے جاتے ہیں۔ ایران میں شاہ عباس اور ہند میں جہانگیر نے تمباکو نوشی کی ممانعت کی لیکن جو معمول فیشن بن جائے اسے کون روک سکتا ہے۔

مُنشیّات

نشہ آور چیزوں میں شراب سرِفہرست ہے۔ شراب سے کئی افسانوی روایات وابستہ ہیں۔ یونان کے ہاں دیونیسیس ۔۔۔ روما کا بکس ۔۔۔ انگور اور شراب کے نشے کا دیوتا تھا۔ فردوسی کہتا ہے کہ جمشید شاہِ ایران نے شراب کشید کرنے کا طریقہ دریافت کیا اور اس کے پینے کے آداب وضع کئے تھے۔ جامِ جمشید اور جامِ جم کی تلمیح فارسی سے اردو شاعری میں آئی۔ کہتے ہیں کہ جمشید کا پیالہ اتنا بڑا تھا کہ بادشاہ کے سوا کوئی شخص اسے لبالب بھر کے پینے پر قادر نہیں تھا۔ اس پیالے میں علمِ نجوم کے حساب سے دائرے بنے ہوئے تھے۔ سنسکرت میں شراب کو سُراپان (ایشور کا مشروب) کہتے تھے۔

شراب انگور، جَو، کشمش، خرما وغیرہ سے کشید کی جاتی ہے۔ مصر کے ملاح بوزہ پیتے ہیں۔ بوزہ جَو کی شراب ہے۔ بیئر بھی جَو سے کشید کی جاتی ہے۔ جنوبی ہند کے غریب لوگ تاڑی پیتے ہیں جو ایک پیڑ کا افشُردہ ہے۔ دیسی شراب عام طور سے گڑ، کیکر کی چھال اور سنگترے کے چھلکوں سے تیار کی جاتی ہے۔ اطباء دو آتشہ، سہ آتشہ شراب کشید کرتے ہیں جسے مُقوّی اور مُسمّن سمجھا جاتا ہے۔ مغربی ممالک فرانس، ہسپانیہ، پرتگال وغیرہ میں اعلےٰ قسم کے میٹھے انگور سے شیمپین، پورٹ، شیری بناتے ہیں۔ سکاٹ لینڈ کی وسکی، روس کی واڈکا، جاپان کی ساکی، انگلستان کی جن تیز نشہ لاتی ہیں۔ سرد ممالک میں بدن کو گرم رکھنے اور چربی دار گوشت کو ہضم کرنے کے لئے شراب پیتے ہیں۔ کھانے کے ساتھ بالعموم شراب پی جاتی ہے۔ پانی تو صرف مریض ہی پیتے ہیں۔ کافرستان کے

باشندے پانی کے بجائے شراب پیتے ہیں اور گلے میں شراب کی تھیلی لٹکائے پھرتے ہیں۔ عربوں کے ہاں نبیذ پینے کا رواج رہا ہے جو کشمش اور خرما کا خیساندہ ہے۔ رات کو مٹی کے پیالے میں کشمش کے دانے اور چھوہارے ڈال کر کھلے آسمان تلے رکھ دیتے ہیں۔ صبح تک اس میں ہلکا سا نشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کشمش اور چھوہارے نکال کر اوپر سے خیساندہ پی لیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ نبیذ حرارت عزیزی کو بحال رکھتی ہے اور بڑھاپے کی کمزوری سے بچاتی ہے۔ عراق کے فقہاء نے نبیذ کی حلت کا فتویٰ دیا تو اس کے پردے میں شراب نوشی کا رواج عام ہو گیا۔ اُمویوں میں ولید ثانی اور بنو عباس میں متوکل شراب میں دھت رہتے تھے۔ اُس زمانے میں مجوسی اور عیسائی شراب کی کشید اور فروخت کا کاروبار کرتے تھے۔ مُغ، مُغبچہ، پیرِ مغاں، ترسا بچہ کی تراکیب اس پر شاہد ہیں۔ عرب جو کی شراب کو فقاع اور پرانی شراب کو قہوہ کہتے ہیں۔ پرانی شراب زیادہ لطیف و تام والی ہوتی ہے۔ فرانس اور سکاٹ لینڈ میں شمپین اور وسکی کی کئی بوتلیں ایک سو سال سے زیادہ کی پرانی ملتی ہیں۔

سلاطین ہند میں مسعود غزنوی، جہانگیر اور محمد شاہ رنگیلا بلانوش تھے۔ مورخ بیہقی لکھتا ہے کہ مسعود غزنوی اپنے ندماء کے ساتھ ساری ساری رات شراب پیا کرتا، فجر کے وقت غسل کر کے وضو کرتا اور نماز کے لئے کھڑا ہو جاتا تھا۔ جہانگیر نے اپنی تزک میں خود اپنی بلانوشی کا اعتراف کیا ہے۔ ظہیر الدین بابر نے کابل میں ایک حوض بنوایا تھا جسے اعلیٰ قسم کی انگوری شراب سے لبالب بھر دیا جاتا تھا۔ بابر اور اُس کے اُمرا حوض کے چاروں طرف بیٹھ جاتے اور پیالے بھر بھر کر پیتے تھے۔ حوض بنوانے کا مقصد یہ تھا کہ صراحیوں سے پیالے بھرنے میں دیر لگتی ہے۔ سلاطین شراب نوشی کی محفلیں خاص اہتمام سے برپا کیا کرتے تھے۔ ندماء ریشمی لباس زیب تن کئے خوشبو لگائے محفل ناؤ نوش میں آتے تھے۔ اس محفل کا لباس خاص قسم کا ہوتا جسے ثیاب الندماء (ندیموں کا لباس) کہتے تھے۔ خوش گل امرد

اور پری چہرہ کنیزیں ساقی گری کرتی تھیں۔ محفل کو گرمانے کے لئے گانے بجانے اور ناچنے والی کنیزیں اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتی تھیں۔ مجمرہ میں بخور جلا کر فضا کو معطر کیا جاتا تھا۔ غرضکہ عیش و عشرت کے تمام لوازم، حسین عورتیں، شراب، خوشبو، موسیقی ـــــ مہیا ہوتے تھے۔ ایران میں شراب کا پیالہ اُٹھا کر کہتے "قربونت شوم" اور تھوڑی سی شراب زمین پر گرا کر باقی غٹا غٹ پی جاتے تھے۔ آج کل مغرب میں شراب کے پیالے آپس میں ٹکرا کر پیتے ہیں اور برمحل جملے کہتے جاتے ہیں۔ شراب کے ساتھ جو شے کھائی جائے اُسے نقل کہا جاتا ہے جو عام طور سے شامی کباب، مچھلی کے بھنے ہوئے قتلوں، نمکین بھنے ہوئے پستے اور چنے کی کھیلوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

بعض اوقات شراب پینے والے حدِ اعتدال سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ کئی بلا نوشوں کا وتیرہ ہے کہ پیٹ بھر کر شراب پیتے ہیں، پھر حلق میں اُنگلی پھرا کر اُسے اُلٹ دیتے ہیں اور دوبارہ پینا شروع کر دیتے ہیں۔ کثرتِ شراب نوشی میں رُوسی اور جرمن اپنا جواب نہیں رکھتے۔ شراب اور شعر کا رشتہ بہت پُرانا ہے۔ کئی اکابر شعراء نشے کی حالت میں فکرِ شعر کرتے رہے ہیں۔ عمر خیام فنا کے تلخ احساس کی چبھن سے فرار کرتے ہوئے شراب پیتا تھا۔ اُس کا فلسفۂ حیات نگارے، چنارے، ربابے، کتابے پر مشتمل ہے۔ ابنِ خلدون کا قول ہے کہ شراب اور عشق شعر گوئی میں معاون ہوتے ہیں۔ مرزا غالب نشے کے عالم میں فکرِ شعر کرتے تھے جب "نفسِ ناطقہ کو تواجد بہم پہنچتا تھا"۔ صوفی شاعروں نے شراب کے حوالے سے معرفت اور حقیقت کے مضامین باندھے ہیں کیوں کہ بقول غالب مضامین خواہ حقیقت و معرفت کے ہوں ساغر و مینا کے حوالے سے ہی باندھے جا سکتے ہیں۔

قُدماء نے شراب نوشی کے چند آداب و قواعد وضع کر رکھے تھے۔ امیر کیکاؤس[1] اپنے بیٹے کو

---

[1] قابوس نامہ

اس کے بارے میں تلقین کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تم ظہر کی نماز کے بعد شراب نوشی شروع کرنا تاکہ نشہ طلوع ہونے تک رات آجائے اور لوگ تمہاری مستی کو دیکھ نہ سکیں۔ جمعہ کے روز شراب پینا نامناسب ہے کہ اس سے نماز کے فوت ہو جانے کا خدشہ ہے۔ صبوحی پینا بھی اچھا نہیں کہ نماز فجر قضا ہو جاتی ہے۔ عمر خیام نے تلقین کی ہے کہ ع کم کم خور و گاہ گاہ خور و تنہا خور۔ ارسطاطالیس کہتا ہے کہ قلیل مقدار میں شراب پینا تریاق کا کام دیتا ہے جب کہ کثیر مقدار میں زہر ہے۔ عربوں نے اس کے قول کا ترجمہ کیا قلیلہ ماء الحیاۃ وکثیرہ سم الحیاۃ۔

شراب عموماً بلور کے پیالوں میں پی جاتی تھی۔ بعض لوگوں نے شراب نوشی کے لیے ایک عجیب و غریب پیالہ ایجاد کیا۔ جب سیتھی اپنے دشمن کو قتل کرتے تو اس کی کھوپڑی کا پیالہ بنوا کر اس میں شراب پیتے تھے۔ شاہ اسمٰعیل صفوی شاہ ایران اور شیبانی خاں ازبک ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ ایک لڑائی میں شیبانی خاں کو شکست فاش ہوئی اور وہ میدان جنگ میں مارا گیا۔ شاہ اسمٰعیل نے اس کی کھوپڑی سونے میں منڈھوا کر پیالہ بنوا لیا جس میں وہ شراب پیا کرتا تھا۔ ہنوں کے سردار کرم نے قیصر روم نقفورتن کو شکست دے کر قتل کر دیا اور اس کی کھوپڑی سے اپنے لیے شراب کا پیالہ بنوا لیا۔ مغل سلاطین شراب نوشی کو لازمۂ شاہی سمجھتے تھے۔ ایک دفعہ نوروز پر جہانگیر نے اصرار بلیغ کر کے اپنے پرہیزگار بیٹے خرم کو شراب پلوائی تھی۔

عیسائیت میں شراب نوشی جائز ہے۔ کلیسائے روم والے اپنی بعض عادات میں شراب پینا واجب سمجھتے ہیں۔ مزدور اپنی کمائی شراب خانوں میں اڑا دیتے ہیں۔ شراب کے پیالے پر عہد و پیماں کیے جاتے ہیں۔ امراء میں شراب نوشی طرزِ حیات بن چکی ہے۔ خاص تقاریب پر شیمپین پیتے ہیں۔ نیا سمندری جہاز پانی میں اتارتے وقت شیمپین کی بوتل اس سے ٹکرا کر پھوڑی جاتی ہے۔ اصلاح

متحدہ امریکہ میں انسدادِ شراب کی سرکاری کوششیں بُری طرح ناکام ہوگئیں۔ مغرب کے بڑے بڑے شہروں میں شراب کو گراں قیمت پر بیچنے کے لئے قحبہ خانے کھولے گئے ہیں۔ جوئے خانوں میں بھی یہی عالم ہے۔ جوان خوبصورت لڑکیاں نیم برہنہ ہوکر گاہکوں کو شراب پلاتی ہیں۔ اس ذیل میں اضلاع متحدہ امریکہ کی ریاست نیواڈا رسوائے عالم ہے۔

مسکرات میں شراب کے علاوہ افیون، بھنگ، چرس، گانجا، مدک ـــ حسین خاں ٹمکیا صوبہ دار لاہور اخروٹ کو بھی مسکرات میں شمار کرتا تھا اور اس کی حُرمت پر اُسے اعتقاد تھا ـــ انسان کو فرار کا سامان بہم پہنچاتی رہی ہیں۔ چرس وہ گوند ہے جو پوست کے پتوں پر جم جاتی ہے۔ اِسے تمباکو کے ساتھ پیتے ہیں۔ گانجا کی گولیاں بھنگ کے پودے کی کلیوں اور کونپلوں کو پان کے پتے کے پانی میں رگڑ کر بناتے ہیں اور چلم میں رکھ کر پیتے ہیں۔ چانڈو اور مدک بھی پوست سے بنائی جاتی ہیں۔ چانڈو ایک خاص قسم کی چلم میں رکھ کر پیتے ہیں جسے نگالی کہتے ہیں۔ یہ نشے اکھاڑوں میں کئے جاتے ہیں جنہیں سندھ میں دائرے کہتے ہیں۔ افیون کی گولی رُوئی میں دبا کر صاف کرتے ہیں۔ اطبّا افیون مُصفّیٰ کو امساک کی دواؤں میں استعمال کرتے ہیں۔ راجپوت اور بلوچ افیون کھا کر میدانِ جنگ میں جاتے تھے۔ پوست ہمارے علاقہ غیر، ترکیہ اور ایران کے سرحدی علاقوں میں کاشت کی جاتی ہے جس سے ہیروئین اور ایل ایس ڈی جیسے ظالم نشے تیار کئے جاتے ہیں جو امریکہ اور یورپ میں بہت مقبول ہیں اور بیش قیمت سمجھے جاتے ہیں۔ مُلکی اور غیر مُلکی سمگلر قید و بند کے خطرات کا سامنا کر کے انہیں امریکہ اور یورپ کے شہروں میں پہنچانے کا دھندا کرتے ہیں۔

شاہ بابر نے اپنی تزک میں معجون کا ذکر کیا ہے جو افیون میں گانجا، لونگ، جاوتری، زعفران، گُل دھتورا، قند اور دُودھ مِلا کر بناتے تھے۔ ہمارے ہاں حکیموں نے اِسے معجونِ فلک سیر کا نام دے رکھا ہے اور اِمساک کے لیئے اِسے موثر خیال کرتے ہیں۔ ایران اور ترکستان میں اِس معجون کا استعمال

عام تھا۔

بھنگ کو سردائی، سدھی، سبزی اور بوٹی بھی کہتے ہیں۔ ملنگوں اور قلندروں کا پسندیدہ مشروب ہے۔ بھنگ میں سبز الائچی اور بادام ملا کر رگڑتے ہیں اور پانی ملا کر پیتے ہیں۔ اس کا نشہ جلد طلوع ہوجاتا ہے۔ الموت کے باطنیہ اپنے نوجوان فدائیوں کو بھنگ (حشیش) پلا کر جنت کی سیر کراتے اور پھر اُنہیں اپنے دشمنوں کو قتل کرنے پر مامور کرتے تھے۔ کئی وزیر اور سالار ان کے خنجروں کا شکار ہوئے۔ گورو گوبند سنگھ اپنے پیروؤں کو بھنگ پی کر میدان جنگ میں جانے کی تلقین کیا کرتے تھے کہ نشے کی حالت میں دلیرانہ لڑیں گے۔ ساموگڈھ کی جنگ میں دارا شکوہ کا حامی راجپوت سردار رام سنگھ روتیلا اور اُس کے راجپوت افیون کھا کر اور تلواریں سونت کر اورنگ زیب کے لشکر میں گھس گئے اور اس بے جگری سے لڑے کہ اُن میں سے ایک بھی زندہ نہ بچا۔

لباس

غاروں کا انسان جاڑے کی ٹھر سے بچاؤ کے لئے جانوروں کی کھالیں اوڑھ لیتا تھا جنھیں عورتیں ہڈی کی سوئی اور تسمے سے سی لیا کرتی تھیں۔ ایران، کشمیر اور افغانستان میں آج بھی لوگ سرما میں پوستین پہنتے ہیں جو پرانے وقتوں کے کھالوں کے لباس سے یادگار ہے۔ کافرستان کے باشندے بکری کی کھال اس طرح پہنتے ہیں کہ بالوں والا حصہ باہر ہوتا ہے اسی لئے انہیں سیاہ پوش کہا جاتا ہے۔ مغرب کی امیر عورتیں قطبی لومڑی کی کھالوں سے تیار کیا ہوا فرغل پہنتی ہیں جو گراں بہا سمجھا جاتا ہے یہ بھی کھالوں کے پرانے لباس کی ایک صورت ہے۔ تمدن کی ترقی کے ساتھ بھیڑوں کی پشم کو کات کر لباس بُنا گیا اور اونی پوشش کا رواج ہر کہیں ہو گیا۔ اُمراء کا لباس نفیس پشم سے تیار کیا جاتا تھا اور غریب صوف یا اونی کھادی کا کھردرا لباس پہنا کرتے تھے۔ عیسائی راہب اور مسلمان صوفی بھی اونی کھادی کا لباس پہنتے تھے تاکہ یہ بدن میں چبھتا رہے اور عبادت کے وقت ان پر نیند کا غلبہ نہ ہونے پائے۔ صوفی کا معنیٰ ہے صوف کا لباس پہننے والا۔

کپاس کا پودا سب سے پہلے وادیٔ سندھ میں کاشت کیا گیا۔ موئن جودڑو اور ہڑپا کپاس بیلنے، سوت کاتنے اور کپڑا بُننے کے مرکز بن گئے۔ ان کا بُنا ہوا سوتی کپڑا عراق کے شہروں کو برآمد کیا جاتا تھا۔ سوتی کپڑا بُننے کی صنعت وادیٔ سندھ ہی سے عراق کو پہنچی تھی۔ شہتوت کے پتوں پر ریشم کے کیڑے پالنے اور ان کے تاروں سے ریشم بُننے کا فن چین میں دریافت کیا گیا اور تاجر ریشمی

کپڑا شاہ راہ قراقرم سے گذرتے ہوئے ایران، شام، کنعان اور رومہ تک لے گئے۔ فینیقیوں نے ریشمی کپڑے کو ارغوانی اور قرمزی رنگ دے کر دور دراز کے ملکوں کے شاہی درباروں اور محلوں تک پہنچادیا۔ ہیلن اور کلیوپیٹرا قرمزی رنگ کا ریشمی لباس پہنا کرتی تھیں اور رومہ کے قیصر ارغوانی رنگ کے چغے اوڑھا کرتے تھے۔

انسان صدیوں سے اونی، سوتی اور ریشمیں لباس پہنتا رہا ہے۔ آج کل نائیلون اور ڈیکرون کے مصنوعی تاروں سے بنے ہوئے کپڑے ان کی جگہ رواج پا رہے ہیں۔ یہ مصنوعی ریشے امریکی سائنس دانوں نے تارکول سے نکالنے کا راز معلوم کیا اور ملبوسات کی دنیا میں انقلاب برپا کردیا۔

سر کو پگڑی یا ٹوپی سے ڈھانپنے کا رواج سرد اور ریگستانی علاقوں سے شروع ہوا۔ گرم مرطوب علاقوں کے باشندوں نے کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ایران، افغانستان، ازبکستان اور قزاقستان میں کلاہ یا پاپاخ اوڑھی جاتی ہے۔ قراقلی بھیڑ کی کھال سے بنی ہوئی کلاہ سب سے قیمتی سمجھی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں کی جناح کیپ اسی کلاہ یا پاپاخ کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ "ترکی ٹوپی" فی الاصل یونان میں اوڑھی جاتی تھی بعد میں ترکی میں رواج پاگئی۔ فارسی میں اسے سرپوش اور عربی میں طربوش کہتے ہیں۔ شاہانِ صفوی کے فدائی ترکمان قزل باش (سُرخ سر) کہلاتے تھے کیوں کہ وہ سروں پر سرخ رنگ کی بارہ گوشہ پہنتے تھے۔ انگریزوں نے تیز دھوپ سے بچنے کے لئے سولا ٹوپی ایجاد کی تھی جسے عام طور سے ٹوپ کہتے ہیں۔ اسکیمو اور سائبیریا کے باشندے سمور کی ٹوپی اوڑھتے رہے ہیں۔ رام پور کی ہلکی پھلکی کشتی نما ٹوپی کانگرسیوں کی قومی ٹوپی بن گئی۔ عرب تیز دھوپ سے بچنے کے لئے سر پر رومال اوڑھ لیتے ہیں جسے عقال سے باندھ دیا جاتا ہے۔ بنو عباس کے دور میں اسے کوفیہ کہنے لگے اور یہ نام آج بھی باقی ہے۔ پہلے پہل کوفہ کے شہر میں اسے موجودہ صورت دی گئی تھی۔ علماء شروع سے عمامہ پہنتے

آتے ہیں جو پندرہ بیس گز تک کے کپڑے کا ہوتا ہے۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ میں جامع قاہرہ میں نماز پڑھنے گیا تو منبر پر جو خطیب بیٹھا تھا اُس کے مُقلد (عمامہ) سے ساری محراب بھر گئی تھی۔ قدیم مصری سر مونڈوا کر اُس پر سر سے چپکی ہوئی ٹوپی پہنتے تھے جس کے ساتھ گردن ڈھانکنے کے لئے رُومال سی دیا جاتا تھا۔ بھاری دستار کا رواج بابلیوں سے ہوا۔ ہندوستان میں مسلمان نسبتاً ہلکی پگڑی، پھینٹا یا صافہ پہنتے تھے۔ راجپوت پیچ دار پگڑی پہنتے تھے۔ شکار پور اور پشاور کی لُنگیاں شمال مغربی ہند میں بڑی مقبول تھیں۔ پٹھان تلے دار ایرانی کُلاہ پر لُنگی پہنتے ہیں جس کا طُرّہ سامنے کی طرف نکالتے ہیں۔ پنجاب میں "ٹوانا پگڑی" کو عز و وقار کا نشان سمجھا جاتا ہے۔ اس کا طُرّہ غیر معمولی طور پر بلند رکھا جاتا ہے۔ مغلوں کے دورِ حکومت میں شاہی ملازم سُرخ پگڑی سے پہچانے جاتے تھے۔ سکھ جُوڑے کو چھپانے کے لئے پگڑی لپیٹتے ہیں۔ ماجھے کے سکھ بعض اوقات پگڑی پر طُرّہ بھی نکالتے ہیں۔

ہندوؤں کے سوا تمام اقوامِ عالم میں چمڑے کے جوتوں کا رواج تھا۔ ہندو لکڑی کی کھڑاؤں پہنتے تھے یا ننگے پاؤں پھرتے تھے کیوں کہ وہ گائے کے چمڑے کے جوتے بنوانے کو معیوب سمجھتے تھے۔ اچھے جوتے گائے یا بچھڑے کے چمڑے ہی کے بنتے ہیں۔ غریب لوگ مُنج کی رسیوں کے جوتے پہنتے رہے ہیں جیسا کہ آج کل بھی کشمیر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ پٹھانوں کی چپّل سے لیکر سلیم شاہی تک فنِ جُفت سازی میں کئی جدتیں کی گئیں اور اُن پر مخمل یا تِلّے سے کڑھائی کا کام بھی ہونے لگا۔ میانوالی کی چپل، چکوال اور تلہ گنگ کے کھوسے اور مُلتانی جُوتے پر نہایت نفیس تِلّے کے بیل بُوٹے کاڑھے جاتے ہیں۔ عورتیں گھیتلے جوتے پسند کرتی رہی ہیں۔ یُونانی اپنی چپل کے تسمے پنڈلی پر کس لیا کرتے تھے۔ ہارون الرشید کی ملکہ زبیدہ نے جوتوں پر ہیرے جواہرات جڑوا کر ایک نئے فیشن کا آغاز کیا تھا۔ یورپ اور روس میں برف باری سے بچنے کے لئے چمڑے کے بھاری بوٹ پہنے جاتے ہیں جو پنڈلیوں کو بھی ڈھک لیتے ہیں۔ برف باری کے دوران

میں پاؤں کی انگلیوں کو پالے کی ٹھر سے بچانے کے لئے جوتوں پر بالاپوش پہنتے ہیں۔ آج کل کی جرابیں پُرانے وقت کے چمڑے کے موزوں سے یادگار ہیں۔

قدیم مصری ننگے پاؤں پھرا کرتے تھے۔ بدن ڈھانپنے کے لئے ایک چادر کمر سے لپیٹ کر اُس کا سرا کندھوں پر ڈال لیتے تھے۔ بابلی اور اشوری قیمتی اور بھاری لباس پہنتے تھے؛ سر پر دستار، لباس کے اُوپر چُغہ جو ٹخنوں تک جاتا تھا۔ بنو عباس کے دورِ حکومت میں درباری لباس کو ثیاب المواھب کہتے تھے جن میں قبا، تلوار اور سیاہ عمامہ بھی شامل تھا۔ بعد میں سر پر اُونچی قلندری کلاہ (قلنسوہ) پر عمامہ لپیٹنے کا رواج ہوا علماء سیاہ طیلسان سے پہچانے جاتے تھے جو لباس کے اوپر پہنی جاتی تھی۔ اعزازی لباس کو تشریف کہتے تھے۔ منگول سلاطین کسی سالار کے غیر معمولی کارنامے سے خوش ہو کر اُسے نو پارچے کا خلعت (لغوی معنیٰ بدن سے الگ کیا ہوا یعنی بادشاہ کا اپنا لباس) بخشتے تھے جسے توقوز کہتے تھے۔ ایرانیوں کا خلعت ہفت پارچہ گراں قدر ہوتا تھا۔ اس میں دستار مُرصع، جڑاؤ خنجر اور پرتلا، سرپیچ اور جیغہ شامل ہوتا تھا۔ اُمراء کا لباس تھا کلاہ، چُغہ زربفت کا، کمربند مُرصع۔ تلوار کا پرتلا جڑاؤ ہوتا تھا۔ شب خوابی کا لباس ہر روز بدل دیتے تھے۔ صلیبی جنگوں سے پہلے عیسائی سلاطین و اُمراء ننگ دھڑنگ سویا کرتے تھے۔ شب خوابی کا لباس عربوں کی دیکھا دیکھی اختیار کیا۔ عرب خلفاء کا لباس ساسانی بادشاہوں سے مُستعار تھا۔ طیلسان اور کلاہ عربی لباس کا حصّہ نہیں ہو سکتا تھا۔ امیر طبقے میں دیباج (ایک کڑھائی کا کپڑا جو دمشق میں بُنا جاتا تھا) دبیقی، مصر کے قبطی بُنتے تھے۔ اس کی دستار پہنی جاتی تھی، ساٹن (عربی زیتونی چاین کے شہر سین تنگ میں بُنی جاتی تھی)، زربفت جس میں سونے کے تار بُنے جاتے تھے، کے ملبوسات مقبول تھے۔ ریشمیں کپڑے پر جو کڑھائی کی جاتی تھی اُسے طراز کہتے تھے۔ یہ لفظ فارسی کے تراز بدن بہ معنیٰ کاڑھنا سے مُعرّب ہے۔ بدن پر پہلے قفطان یا چھوٹی قمیض پہنتے تھے۔ اس کے اُوپر امیر لوگ قبا اور عزیب عبا اوڑھ لیتے تھے۔

مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندو کمر سے لنگوٹی باندھتے تھے اور ننگے پاؤں ننگے سر رہتے تھے عورتیں ایک بے سِلی چادر کمر سے باندھ کر اس کا پلو سر پر ڈال لیتی تھیں۔ اسے ساری کہتے ہیں۔ بابر کی تزک سے معلوم ہوتا ہے کہ ہند میں خیاطی کا ہنر نہیں تھا۔ خیاط مسلمان حملہ آوروں کے ساتھ ایران اور خراسان سے آئے تھے۔ مغل سلاطین اور اُمرا ریشمیں لباس پہنتے تھے۔ زربفت، طلادوز، کمخواب، کلابتون، تاش، منقشکار کے ملبوسات پہننے کا رواج تھا۔ گرمی کے موسم میں چوتار، ململ، نین سُکھ، گنگاجل، بھیروں، بہادر شاہی، محمودی، چھینٹ (مُلتان کی مشہور تھی) کے ملبوسات پہنے جاتے تھے۔ ململ اسقدر نفیس ہوتی کہ اس کا تہ در تہ لباس بھی بدن کو ڈھانپ نہیں سکتا تھا۔ ایک دفعہ اورنگ زیب نے اپنی بیٹی زیب النساء کو ململ کے لباس میں دیکھ کر سرزنش کی تھی۔ شہزادیاں سروں پر تاج کُلاہ پہنتی تھیں۔ ہمایوں کے زمانے میں شہزادیوں نے کلغی دار دستار جس میں جواہرات اور موتی ٹکے ہوتے تھے پہننا شروع کی۔ انگیا اور لہنگا راجپوت عورتیں پہنتی تھیں۔ مسلم خواتین عام طور سے پیش واز یا تنگ پائجامہ پہنتی تھیں۔ انگیا کُرتی کا فیشن شہزادی زیب النساء نے شروع کیا۔

ایران، خراسان اور ترکستان میں عورتیں چہروں پر نقاب ڈال لیتی تھیں لیکن آنکھیں کُھلی رکھتی تھیں۔ تاجیک عورتیں گھوڑے کی دُم کے بالوں کا نقاب اوڑھتی تھیں جسے روبند کہا جاتا تھا۔ پرانے وقتوں میں نظرِ بد سے بچنے کے لئے عورتیں اور خوبصورت مرد نقاب اوڑھا کرتے تھے۔ محمد بن عمرہ کندی شاعر نقاب پہن کر باہر نکلتا تھا۔ امین الرشید نقاب کے بغیر دربار میں نہیں آتا تھا۔ تنجہ اور الجزیرہ کے ملثمین (لثام یا نقاب اوڑھنے والے) کھلے مُنہ باہر نہیں نکلتے تھے حالاں کہ اُن کی عورتیں کھلے مُنہ باہر جاتی تھیں۔ ایک مُتنبیٔ مقنع (نقاب پوش) کا ذکر تاریخ میں محفوظ ہے۔

دلّی میں چھوٹی قمیض کو پیراہن کہتے تھے۔ لکھنؤ میں انگرکھا (انگ: جسم، رکھا: محافظ سنسکرت کا لفظ ہے) مقبول ہوا۔ چپکن اور انگرکھا کو ملا کر اچکن بنی جو حیدرآباد میں شیروانی کہلائی۔ کُھنیوں تک

کا شلوکا نیمہ جامہ کہلاتا تھا۔ سینے پر گھنڈیاں ہوتی تھیں۔ اِس کے اوپر جامہ پہنتے تھے جو قبا سے ملتا جلتا تھا عورتیں گھروں میں اِزار یا پشواز پہنتی تھیں۔ بعض اوقات چُست پاجامے پر پشواز پہنی جاتی تھی۔ سروشِ سخن میں رنڈیوں کے لباس اور زیورات کی تفصیل دی گئی ہے

"لشکر کی رنڈیاں نوجوان، پاؤں میں زرد مخملی بوٹ، گلبدن کا پائجامہ، ساسرلیٹ کی چوڑی گوٹ، دیکھنے والوں کا جی لوٹ، لاہی کی انگیا کُرتی مصالحہ لگا، کُرتی سر کی پیٹ کُھلا، اوپر سے دوشالے وزد اوڑھے ہوئے چولی کچھی صاف وشفاف پلکے کا مُوباف، پٹی جمی، گلوری کلّے میں دبی، ہاتھوں میں سونے کے کڑے، پاؤں میں تین تین چھڑے گلے میں چمپا کلی، دھک دھکی، بازو پر نورتن، ناک میں کیلی، کانوں میں سادے سادے پتّے بالیاں۔"

شلوار ایران سے آئی، عربوں نے اِسے سروال بنا لیا۔ سکھ عورتوں نے سُتھنا کہہ کر اُسے اپنا لیا۔ وہ سر پر پھلکاری اوڑھتی تھیں جس پر پٹ کی کڑھائی کی جاتی تھی۔ پنجاب میں مسلمان عورتیں سالوں اوڑھتی تھیں۔ سر پہ چُنّی یا ہلکا دوپٹہ، کمر میں چادر، کھاتے پیتے مرد پُٹ کا لاچا باندھتے تھے جس کا حاشیہ سُرخ ہوتا تھا۔ بھیرے اور پنڈدادنخان کے لاچے مشہور تھے۔ دیہات میں کُرتا پہننے کا رواج تھا جس میں سینے پر تکما لگایا جاتا تھا۔ یہ کُرتا قدیم دراوڑوں سے یادگار ہے۔

سُرخ، زرد اور سبز کو شادی بیاہ کے رنگ کہا جاتا ہے جو خوشی کی علامت بن گئے ہیں۔ زرد چینیوں کا قومی رنگ تھا۔ بودھ سوامی زعفرانی رنگ کی چادریں اوڑھتے تھے اس لئے عرب اُنہیں مُحمّرہ (سُرخ پوش) کہتے تھے۔ سادات سبز رنگ کا لباس پہنتے تھے۔ شریفہ (سیدانی) کا برقع سبز رنگ کا ہوتا تھا۔ خاکی رنگ کی فوجی وردی ایرانیوں کی اختراع ہے جو انگریزی فوج میں رواج پا گئی۔ مغرب میں مردوں

کا لباس کم و بیش ایک سا رہا ہے البتہ عورتوں کے لباس میں نئے نئے فیشن آتے رہے ہیں۔ انیسویں صدی میں مغربی عورتوں کا لباس ٹخنوں تک ہوتا تھا پھر جو گھٹنا شروع ہوا تو بیسویں صدی کے اوائل میں گھٹنوں کے اوپر تک گیا اور اب جنوبی ممالک میں چڈی کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ نہانے کا لباس محض تکلف بن کر رہ گیا ہے۔ مردوں کو لبھانے کے لئے مغربی عورتیں چھاتیوں اور کولہوں کے ابھار کی نمائش بڑے اہتمام سے کرتی ہیں۔ عورتوں کی ٹوپیوں کے فیشن ہر سال بدلتے رہتے ہیں۔

استوائی علاقوں میں رہنے والے جنگلی قبائل مادر زاد ننگے پھرتے ہیں۔ ڈاروِن کہتا ہے کہ ایک دفعہ میں نے چند وحشی عورتوں کی برہنگی پہ ترس کھا کر انہیں کپڑوں کا ایک تھان دیا کہ اس سے لباس بنا لیں۔ دوسرے دن دیکھتا کیا ہوں کہ ستر پوشی کے بجائے عورتوں نے تھان کے فیتے کاٹ کاٹ کر گردن اور بازوؤں میں سجا لئے ہیں اور بدستور ننگ دھڑنگ پھر رہی ہیں۔ ہندوستان میں شیو بھگت سادھو آزادانہ ننگے پھرتے ہیں اسی لئے انہیں ناگے کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں سعیدائے سرمد جیسے فقیر اور قلندر ستر پوشی کا تکلف نہیں کرتے تھے۔ ملنگ دلق یا گودڑی اوڑھتے ہیں جو رنگ برنگ کے چیتھڑے سی کر بنائی جاتی ہے۔ جاڑے میں پھتوئی (واسکٹ جس میں روئی بھری ہو۔ عربوں کا جبہّ) پہنتے ہیں جس پر سینے کی جانب گھنڈیاں لگی ہوتی ہیں۔ سردی سے بچاؤ کے لئے روئی دار جُبّہ پہنتے ہیں جسے دگلا کہتے ہیں۔

لباس کی تراش خراش پرانے وقتوں سے بدلتی رہی ہے۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ کسی بڑے آدمی نے اپنے بدن کے کسی نقص کو ڈھانپا تو اس سے ایک نیا فیشن چل نکلا۔ اس کی ایک مثال ہارون الرشید کی بہن علیّہ کے سوانح حیات میں ملتی ہے۔ علیّہ کی پیشانی بہت چوڑی تھی اور اُسے ناگوار گذرتی تھی۔ اس عیب کو چھپانے کے لئے علیّہ نے حریر کی مطرّز پٹی ماتھے پر باندھنا شروع کی۔ دیکھتے دیکھتے حرم میں چاروں طرف اس کا رواج ہو گیا اور خواتین نے ماتھے پر پٹیاں سجا لیں بعض جلیلی

کنیزوں نے پٹیوں پر مختصر جملے اور مصرعے کاڑھنا شروع کئے مثلاً "من کان لنا کان اللہ (جو ہمارا ہے ہم اُس کے ہیں) اِس پٹی کو عصابہ کہا جاتا تھا۔

یورپ کے ممالک میں عہدِ وسطیٰ میں یہودیوں اور کسبیوں کو اپنے لباس پر نمایاں طور پر گول زرد رنگ کا ٹکڑا سینا پڑتا تھا تاکہ وہ پہچانے جائیں۔ اسے "شرم کا نشان" کہتے تھے۔ انقلاب سے پہلے کے روس میں کسی یہودی لڑکی کو یونیورسٹی میں داخلہ اِس شرط پر دیا جاتا تھا کہ وہ لباس پہ زرد رنگ کا ٹکڑا پہنے گی۔ ایک دفعہ نواب حسین خاں صوبہ دار لاہور بازار سے گھوڑے پر سوار گذر رہا تھا کہ اُس نے ایک نہایت پاکیزہ صورت سفید ریش پیرمرد دیکھا۔ نواب بے اختیار اُس کی تعظیم کے لئے گھوڑے سے نیچے اُتر آیا۔ پتہ یہ چلا کہ وہ کوئی بوڑھا ہندو تھا۔ یہ معلوم کر کے نواب کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اُس نے حکم دیا کہ لاہور کے تمام ہندو اپنے لباس پر زرد رنگ کا ٹکڑا پہنا کریں تاکہ دوبارہ یہ غلط فہمی نہ ہو۔ زندہ دلان لاہور نے اُس کا نام حسین خاں ٹکڑیا رکھ دیا۔ وہ تاریخ میں اِسی نام سے جانا جاتا ہے۔

★

وضع قطع، زیبائش

سر کے بالوں اور ڈاڑھی کی تراش کے انداز بدلتے رہے ہیں. قدیم مصری سر کے بال مونڈوا دیتے تھے لیکن سر کے ایک طرف بالوں کی لٹ چھوڑ دیتے تھے جیسا کہ ہندوؤں کی "بودی" ہوتی ہے. اشوری اور بابلی لمبے بال رکھتے تھے. پٹے اُسی زمانے سے یادگار ہیں. پٹوں کے ساتھ گھنے گلمچھے رکھنے کا رواج تھا تاکہ چہرہ شیر ببر کی طرح دکھائی دے اور دشمن کے دل میں ہیبت پیدا ہو. بہا آفرید زوزانی نے جس نے سفاح عباسی کے عہد میں بغاوت کی تھی اپنے پیروؤں کو سر اور ڈاڑھی کے بال کتروانے سے منع کر دیا تھا جیسا کہ گورو گوبند سنگھ کے کہنے پر سکھوں نے جسم کے بال چھوڑ دیئے. سکندر اعظم نے تاریخ میں پہلی بار اپنے سپاہیوں کی ڈاڑھیاں مونڈوا دیں کہ لڑائی میں ڈاڑھی سے دشمن کے قابو میں نہ آجائیں. رُوس میں زار پیٹر اعظم اور ترکیہ میں مصطفےٰ کمال پاشا نے ڈاڑھی مُونڈوانے کا حکم دیا. رات بھر شہر کے حجام ڈاڑھیاں مونڈتے رہے. صُبح تک گلی کوچوں میں بالوں کے ڈھیر لگ چکے تھے. مذہبی رہنما اور پروہت سوائے قدیم مصری پروہتوں اور ہندی برہمنوں کے شروع سے ڈاڑھی بڑھاتے آئے ہیں. مُسلمان شرفاء میں ڈاڑھی کے ساتھ سر پہ لمبے بال رکھنے کا رواج نہیں تھا. بقول غالب اِدھر ڈاڑھی رکھی اُدھر سر مُونڈوا دیا. مسلمانوں کے مختلف فرقے ڈاڑھی مونچھ کی تراش سے پہچانے جاتے ہیں. ایک فرقہ مُونچھیں مونڈوا دیتا ہے اور ڈاڑھی بڑھا لیتا ہے تو دوسرا گھنی مُونچھوں کے ساتھ ٹھڈی پر ڈاڑھی کے علامتی بال رکھ لیتا ہے. مُسلمان سر اور ڈاڑھی کے سفید بالوں میں مہندی اور وسمہ لگاتے ہیں جب کہ سکھوں میں اس کی سخت ممانعت ہے.

ہندوستان میں چاند پر گردا ـــ چوکور منڈی ہوئی جگہ ـــ رکھنے کا رواج تھا۔ دیہات میں جاٹ اور کھتری آج بھی گردا رکھتے ہیں۔ راجپوت کانوں میں سونے کی مُندریاں پہنا کرتے تھے۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان عورتیں کان نہیں چھدواتیں جب کہ ہندو عورتیں کان چھدوا کر بالیاں پہنتی ہیں۔ گورو بالناتھ کے جوگی کان پھڑوا کر مُندرے پہنا کرتے تھے۔ انہیں کن پاٹے کہتے تھے۔ مُندرے پہننا گویا گورو کی غلامی کا اظہار تھا۔ کسی زمانے میں غلاموں کے کانوں میں حلقے ڈالے جاتے تھے۔ حلقہ بگوش کی ترکیب اسی رسم سے یادگار ہے۔ کافرستان اور گلگت میں بیاہتا عورتیں کانوں میں بالیاں پہنتی ہیں کنواریوں کو اس کی اجازت نہیں ہے۔ چین میں تمام مردوں کو عورتوں کی طرح چوٹی رکھنا پڑتی تھی جو شہنشاہ کی غلامی کی علامت تھی۔

چین اور ہندوستان میں عورتیں بالوں میں پھول سجاتی رہی ہیں۔ جوڑے کے گرد موتیے کے پھولوں کے گجرے لپیٹنے اور گلے اور کلائی میں پھول پہننے کی رسم آج بھی باقی ہے۔ موتیے اور چنبیلی کے پھول سیج پر بھی بکھیرے جاتے ہیں۔ لوئی چہاردہم شاہِ فرانس کے عہد میں عورتیں سر کے بال اتنے اونچے سجاتی تھیں کہ بعض اوقات ناچتے وقت ان کی چوٹیاں شمعدانوں سے ٹکرا جاتی تھیں۔ آج بھی آرائش گاہوں میں مختلف وضع کے بال بنوانا بے کار امیر عورتوں کا محبوب مشغلہ ہے۔ جن عورتوں کے بال چھوٹے اور چھدرے ہوں وہ بازار سے بنے بنائے جوڑے خرید کر بالوں میں لگاتی ہیں۔ مردوں میں بھی مصنوعی بال پہننے کا رواج ہے۔ بودھ اور سادھو سر کی چوٹی پر بالوں کا جوڑا باندھا کرتے تھے جیسا کہ سکھوں میں بھی رواج ہے بعض عورتیں اسی طرح کا جوڑا اپنے سر کے درمیان پہنتی ہیں اور ایک قدیم رسم نیا فیشن بن گئی ہے۔ ایک زمانے میں کنواری دیہاتی لڑکیاں نائن سے بالوں کی مینڈھیاں گندھوایا کرتی تھیں جو بیاہ کے دن کھول دی جاتی تھیں۔ مغربی عورت نے بال کٹوا دیئے ہیں اور مرد نے بال رکھ لئے ہیں۔ جہاں تک بال رکھنے کے نئے فیشن کا تعلق ہے مرد عورت میں فرق مٹتا جا رہا ہے۔ ترکستان، ایران، ازبکستان، کرغیزیا میں عورتیں سر کے بال

دو لٹوں میں بٹ کے کندھوں پر ڈالتی ہیں۔ فارسی کی ترکیب زلفِ دوتا اِسی رواج سے یادگار ہے۔ ایرانی عورتوں میں طرّہ، چتر اور کاکل رکھنے کا رواج تھا۔ عرب عورتیں کانوں کے قریب، رخساروں پر ان کی شکل کی لٹ بناتی تھیں جسے "بچھو کی دُم" کہا جاتا تھا۔ ہمارے ہاں پٹی جمانے کا رواج تھا۔ دیہاتی عورتیں سر میں مانگ رکھتی ہیں۔ ہندو سُہاگنیں مانگ میں سیندور لگاتی ہیں۔

قدیم کریٹ کی عورتیں اپنی چھاتیاں برہنہ رکھتی تھیں۔ لوئی چہاردہم کے دربار میں بقول موں تین عورتیں ناف تک سینہ برہنہ رکھ کر آتی تھیں۔ ناف اور چھاتیوں کے سروں پر سُرخی لگائی جاتی تھی۔ پچھلے دنوں یہ فیشن ٹاپ لیس کے نام سے اضلاعِ متحدہ میں چل نکلا تھا۔

عورتیں ہمیشہ ننھے منّے پاؤں اور گول ٹخنوں پر فخر کرتی رہی ہیں کشیدہ قامت عورت (عربوں کی الفیہ یعنی ا کی طرح سیدھی، ایرانیوں کی سروِ رواں) جس کے ہاتھ پاؤں چھوٹے چھوٹے اور گداز ہوں خاص طور سے خوبصورت سمجھی جاتی ہے۔ ہاتھوں کی شمعی انگلیاں رعنائی میں اضافہ کرتی ہیں۔ انقلاب سے پہلے جنوبی چین میں لڑکیوں کے پاؤں بچپن میں کس کر باندھ دیئے جاتے تھے جو بلوغت پر ننھے منّے سے رہ جاتے۔ ایسے پاؤں کو کنول کے پھول کہتے تھے۔ عورتیں اپنے شوہروں کے سوا کسی کو یہ پاؤں نہیں دکھاتی تھیں۔ حُسنِ نسوانی کے مُبصّر کہتے ہیں کہ چھوٹے پاؤں والی عورت کی چال اور سُرین کی جُنبش میں بڑی نفس پرور تمک پیدا ہو جاتی ہے۔

علمِ انسان کے طلبہ کے خیال میں زیوروں کا آغاز ٹونے ٹوٹکوں اور تعویذ گنڈوں سے ہوا تھا۔ عام طور سے سر کے بالوں، ناک، پیشانی، کانوں، گلے، کلائی، بازو، ہاتھ کی انگلیوں اور ٹخنوں میں پہننے کا رواج رہا ہے۔ اقوامِ عالم میں ان کی تراش خراش البتہ بدلتی رہی ہے۔ ہندو عورتیں ماتھے پر شیش پھول، سر پہ جھومر اور ٹیکا، گلے میں کنٹھا، ہاتھ میں آرسی، پاؤں میں پائل، کمر میں چاندی کی گھنگریوں کا کمربند جو

اِٹھلا اِٹھلا کر چلنے سے جھنجھنا اُٹھتی تھیں، پہنا کرتی تھیں۔ مُغل خواتین نے ہندوستان، ایران اور عرب کے زیور ملا کر ان کی تراش خراش میں جدّتیں پیدا کیں۔ وہ عام طور سے کلاوہ، انگوٹھی، موتیوں کا ہار، کرن پھول، چوڑی کڑا، پہونچی، چمپا کلی، پیپل پتی، لونگ، پازیب، نتھ، گلوبند، ہنس، کنگن، گجرے، بازوبند، دُر، بنیر، بلاق پسند کرتی تھیں۔ شہزادیوں کے زیوروں میں ہیرے جواہرات جڑے ہوتے تھے۔ عرب ممالک میں عِقد، خاتم، طوق اور خلخال پہننے کا رواج رہا ہے۔ ہمارے ہاں رنڈیوں میں نتھلی کنوارپنے کی نشانی سمجھی جاتی ہے۔ کنواری نوچیاں اپنی نتھلی سے پہچانی جاتی ہیں۔ اسی سے محاورہ بنا ہے "نتھلی اُتارنا"۔

راجپوتوں کی دیکھا دیکھی مسلمان اُمراء اور سلاطین بھی ریشمیں لباس کے ساتھ سونے کے زیور اور سُچّے موتیوں کے ہار پہننے لگے۔ راجپوت اور سکھ سردار کلائیوں میں سونے کے بھاری کڑے پہنتے تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ میدانِ جنگ میں سونے کے کئی کئی کڑے پہن کر جاتا تھا۔ جب کوئی سپاہی غیر معمولی بہادری دکھاتا مہاراجہ وہیں ایک کڑا اُتار کر بخش دیتا تھا۔

ایران، خراسان اور شمال مغربی سرحدی علاقوں میں عورتیں خوبصورتی کے لئے ٹھوڑی اور گالوں پر خال گدواتی ہیں۔ ایران میں اسے دلاّ کی کا فن کہتے ہیں۔ خال کو چہرے کی زیبائش کے لئے ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ قدرتی خال نہ ہو تو مصنوعی گدوا لیتی ہیں۔ ہارون الرشید کی ایک محبوب کنیز گال پر خوبصورت خال ہونے کے باعث ذات الخال (خال والی) کہلاتی تھی۔

خوشبو کا استعمال پرانے وقتوں میں عبادت اور زیبائش کا لازمہ رہا ہے۔ بابل، مصر، یُونان، روما اور ہند کے مندروں میں شب و روز بخور جلائے جاتے تھے۔ صندل، عُود اور مُر کی لپٹوں سے مندروں کے در و دیوار مہکائے جاتے تھے جس سے پجاری اور یاتری مست و بیخود ہو جاتے تھے۔ موسیقی کی طرح خوشبو بھی جذبۂ مذہبیت کو تحریک دینے میں موثر کردار ادا کرتی رہی ہے۔ آج بھی ہندوؤں کے مندروں میں چندن

اور اگر کی رُوح افزا لپٹیں آتی رہتی ہیں۔ تنتر مت کے پُجاری خلوت میں چندن کے محلول سے منڈل (مقدس دائرہ) بناتے ہیں۔ مجوسی آگ میں خوشبودار لکڑیاں ڈالتے رہتے ہیں۔

شادی بیاہ اور عیش و عشرت کی مجلسوں میں اُمراء اپنے بدن اور لباس کو مُعطر کر کے شامل ہوتے ہیں۔ نپولین کی ملکہ اپنا رُومال مُشک میں لبسائے رکھتی تھی۔ سیمی رامیس، ایزبل، میسالینا، ہیلن، دلائلہ، تائیس، تھیوڈورا اور کلیوپیٹرا کی بے پناہ جنسی کشش کا راز عطریات ہی میں تھا۔ شیکسپیر کلوپیٹرا کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ اپنا بدن اور لباس اسقدر مُعطر رکھتی تھی کہ ہوائیں بھی اُس کے عشق کی مستی میں گرانبار ہو جاتی تھیں۔ فرانس کی ایک حسینہ جبریلے نے شاہ ہنری چہارم کو پسینہ پونچھنے کے لئے اپنا مُشک میں لبسایا ہوا رومال دیا تو وہ اُس کے عشق میں دیوانہ ہو گیا۔ ترکستان اور ایران میں غالیہ، نَد، مُر، عُود اور عنبر بہت مقبول خوشبوئیں تھیں۔ لوگ عنبر کو چمڑے کی چھوٹی سی تھیلی میں منڈھوا کر گلے میں لٹکاتے تھے اور ملبوسات میں مُشک نافہ رکھتے تھے۔

مغلیہ دور میں وہ کمرہ جس میں خوشبوئیں، عطریات اور تیل رکھے جاتے تھے شمیم خانہ کہلاتا تھا۔ مُشک نافہ نیپال اور تبت کے کستورا ہرن کو شکار کر کے حاصل کرتے تھے۔ پھولوں سے عطر اور جوہر کشید کرنے کی روایت بہت پرانی ہے۔ وسطی زمانوں میں عطر بنفشہ مغرب میں بہت مقبول تھا۔ اس کے علاوہ گل لالہ، موتیا، گلاب، چنبیلی اور موتیا کے عطریات بدن پر ملنے کا رواج تھا۔ عطرِ جہانگیری ملکہ نور جہاں کی ماں احسان بیگم کی ایجاد ہے۔ دلی اور لکھنؤ کے روساء خلوت میں عطر حنا مل کر جاتے تھے۔ کوئی شخص کسی طوائف کے کوٹھے پر جاتا تو وہ سب سے پہلے اُس کے گریبان میں عطر حنا ملتی تھی اور پھر پان کا بیڑا پیش کرتی تھی۔ الف لیلہ و لیلہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں اپنے بدن کو عطریات میں لبسائے رکھتی تھیں۔ ایک کنیز قمر النساء کہتی ہے۔

"میں لطیف عطریات سے اپنے شکم، سینے اور بدن کے دوسرے حصوں کو لبسا لوں گی تاکہ میرا بدن شیرینی کی طرح تیرے مُنہ میں گھُل جائے۔"

شاہان ایران کی خلوت میں بھیجنے سے پہلے نو خیز کنیزوں کے بدن پر کئی روز خوشبودار اُبٹنے ملے جاتے تھے۔ عورتیں اُن کے بدن میں عُود، مُر اور لوبان شامی کی دھونی دیتی تھیں۔ جنسی نفسیات کے علماء کرافٹ ایبنگ، ہیولاک ایلس اور ہرشِن فیلڈ کے بقول خوشبوؤں میں مُشک سب سے زیادہ ہیجان آور اور نفس پرور ہے۔ اِس کی لپٹوں سے جنسی جذبے کو بے پناہ تحریک ہوتی ہے۔ آج کل فرانس اور جرمنی سے جو قیمتی خوشبوئیں آ رہی ہیں اُن کا جزوِ اعظم مُشک ہی ہوتا ہے۔ اہلِ مغرب کی محفلوں میں ہر عورت اپنی خاص خوشبو سے پہچانی جاتی ہے۔

ہمارے ہاں عورتیں زیبائش کے لئے آنکھوں میں کاجل لگاتی ہیں۔ ابتداء میں کاجل بدروحوں کو بھگانے کے لئے لگایا جاتا تھا۔ ماتھے پر بندی اور دانتوں پر مِسّی لگانے کا رواج ہندو عورت سے خاص رہا ہے۔ پنجابی عورتیں ہونٹوں اور دانتوں پر اخروٹ کے درخت کی چھال ملتی ہیں جسے سندھ میں مُساگ اور پنجاب میں چھوڈا یا سکڑا کہا جاتا ہے۔ اِس سے دانت صاف ہو کر چمکنے لگتے ہیں اور ہونٹوں پر سرخی کا لاکھا جم جاتا ہے۔

ہندوؤں، عربوں اور جرمنوں میں بوجھل کولہے عورت کے حُسن اور کشش میں اضافہ کرتے ہیں۔ جرمن زبان میں سُرین کے لئے ہنڑ باکن (پیچھے کے رخسار) کی ترکیب ہے۔ فارسی کے ایک شاعر نے سُرین کی غیر معمولی فربہی اور کمر کے پتلے ہونے کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے ؎ کوہ را با تارِ موئے بستہ آخر چساں؟ جس عرب عورت کے کولہے بھاری نہ ہوتے وہ اپنی سُرین پر گدا باندھ لیتی تھی تاکہ اُن کا اُبھار نمایاں ہو جائے۔ اسے زنجبہ کہتے ہیں۔ ہندو بھی فربہ کولہوں پر مرتے رہے ہیں جیسا کہ اُن کے مندروں میں نصب یکشنیوں اور اپسراؤں کے بُتوں کے کولہوں سے معلوم ہوتا ہے۔ آج کل اضلاع متحدہ امریکہ میں غیر معمولی اُبھری ہوئی چھاتیوں کو حُسنِ نسوانی کا لازمہ سمجھا جاتا ہے۔ چھاتیوں کے اُبھار کو نمایاں کر دکھانے کے لئے مصنوعی وسائل بھی اختیار کئے جاتے ہیں۔

آداب و اطوار

قدیم زمانے میں ہاتھ اُٹھا کر یا مصافحہ کر کے ملنے سے یہ جتلانا مقصود ہوتا تھا کہ میرے ہاتھ خالی ہیں اور میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے جس سے کسی قسم کا خطرہ ہو سکتا ہو۔ یہ رواج اُس دور سے یادگار ہے جب ہر وقت ہر شخص سے جان کا خطرہ لاحق رہتا تھا۔ قدیم روما میں پورا بازو اٹھا کر ایک دوسرے کو سلام کیا کرتے تھے۔ یہی طریقہ بعد میں نازیوں نے اختیار کیا۔ عرب اور ایرانی دوست آمنے سامنے آتے تو ایک دوسرے سے گلے ملتے اور گالوں پر بوسہ دیتے تھے۔ ہندو دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کہتے ہیں یا بزرگوں کے پاؤں چھو کر "پیریں پوناں" کہتے ہیں۔ یہودیوں کا سلام ہے شولوم علیخم جو عربی میں سلام علیکم بن گیا۔ سُنی مسلمان السّلامُ علیکم کہتے ہیں جب کہ شیعہ سلامٌ علیکم کہتے ہیں۔ مُرید پیر صاحب کے پاس آئے تو اُس کے ہاتھ چوم کر سر آنکھوں سے لگاتا ہے اور سر سجدے میں رکھ دیتا ہے۔ اسے "سجدۂ تعظیمی" کہتے ہیں۔

چین اور مصرِ قدیم میں رواج تھا کہ جب کوئی بزرگ راستے میں ملتا تو نوجوان ادب سے ایک طرف ہٹ جاتے تھے۔ کوئی بزرگ کسی محفل میں آتا تو نوجوان سروقد کھڑے ہو کر اُس کی تعظیم کرتے تھے اور اُسے مناسب جگہ پر بٹھایا جاتا تھا۔ بادشاہوں نے عجمی طور طریقے اختیار کئے تو سلاطین کے سامنے سجدہ کرنے کا رواج ہوا۔ کوئی شخص شاہانِ ایران کے حضور باریاب ہوتا تو وہ اپنے منہ پر کپڑا لپیٹ لیتا تھا مبادا اُس کے سانس سے بادشاہ سلامت آلودہ ہو جائیں۔ بادشاہ کے تخت کے سامنے جالی کا پردہ پڑا رہتا تھا۔ لب اوقات جالی چوم کر سجدے میں گر پڑتے تھے۔ بادشاہ گھوڑے پر سوار ہوتا

تو اُس کی رکاب چُومتے تھے۔ جلال الدین اکبر نے زمین بوس کو رواج دیا یعنی اُس کے سامنے جا کر لوگ زمین چُومتے تھے۔ بادشاہ کے حضور باریاب ہونے والا سر جُھکا کر زمین کے قریب لے آتا اور نقیب کی آواز پر تین دفعہ زمین چُومتا تھا۔ کورنش کا رواج ترکستان سے آیا تھا۔ کورنش بجا لانے والا اپنے داھنے ہاتھ کی ہتھیلی پیشانی پہ رکھ کر کئی بار سر جُھکاتا تھا اور داھنے ہاتھ سے زمین چھُو کر سات دفعہ اپنی پیشانی تک لے جاتا تھا۔ سلیم شاہ سُوری بعض اوقات ایک کرسی پہ اپنی کمان اور جُوتے رکھوا دیتا جن کے سامنے اُمراء کورنش بجا لاتے تھے۔ تسلیم کا طریقہ یہ تھا کہ جُھک کر داھنے ہاتھ کی ہتھیلی سر پر رکھ کر آہستہ آہستہ سیدھے کھڑے ہوتے تھے۔ لکھنؤ اور دلّی میں شرعی سلام علیک ترک کر دیا گیا اور ایک دوسرے کو آداب یا تسلیمات کہنے لگے۔ سکھ ایک دوسرے کو ملیں تو "فتح بلاتے ہیں" یعنی کہتے ہیں "واہ گورو جی کی فتح" یہی اُن کا سلام ہے۔ ہندوؤں میں اسیس کا طریقہ یہ ہے کہ پروہت دونوں ہاتھ جوڑ کر کسی شخص کے سر تک لے جاتا ہے۔

اکبر کے دینِ الٰہی میں ایک نیا سلام رواج دیا گیا۔ دینِ الٰہی کے پیرو راستے میں ملتے تو ایک کہتا "اللہ اکبر" دوسرا جواب دیتا "جلّ جلالہ"۔ زندہ دلانِ لاہور نے ایک نیا سلام ایجاد کیا ہے۔ دو دوست آمنے سامنے آجائیں تو ایک اپنا داھنا ہاتھ اُوپر اُٹھا کر کہتا ہے "آؤ میرے بادشاہ" دوسرا اپنا ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر کے جواب دیتا ہے "اللہ بادشاہ"۔

قدیم یُونانی ملتے وقت کہا کرتے تھے "چیر"۔ انگریز ملیں تو وقت کی مناسبت سے صبح بخیر یا شام بخیر کہتے ہیں گھر سے باہر جاتے وقت اپنی بیوی کا بوسہ لیتے ہیں۔ اُن کے بچے خواب گاہ میں جانے سے پہلے اپنی ماں کے گال چُومتے ہیں۔

آدابِ محفل اقوامِ عالم میں مختلف رہے ہیں۔ فرعون اور اُس کے اُمراء کرسیوں پر بیٹھا کرتے تھے۔ بابل اور اشور کے سلاطین کی نشست تخت پر ہوتی تھی جس پر گدے بچھا کر چتر تان لیا کرتے

تھے۔ یورپ میں امیر غریب سب بنچوں پر بیٹھتے تھے۔ مشرقی ممالک میں عام طور سے فرشی نشست کا رواج رہا ہے۔ شاہی محلوں میں قیمتی قالین بچھائے جاتے تھے۔ ایران، سمرقند، بخارا اور ترکی کے قالین عمدہ ہوتے تھے۔ دیواروں کے ساتھ خز کے پردے لٹکاتے تھے۔ خلفائے بنو عباس ساسانی بادشاہوں کی طرح مسند پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھتے تھے۔ مسند حریر اور دیبا کی تیار کی جاتی تھی۔ عام رواج یہ تھا کہ چٹائی جس میں روئی بھر دی گئی ہو بچھا لیتے تھے اور اُس پر گاؤ تکیے رکھ دیتے تھے۔ اسے مرتبہ کہا جاتا تھا۔ مرتبہ کو لکڑی یا مٹی کے چبوترے پر جسے مصطبہ کہتے تھے بچھا دیا جاتا تھا یا اُس کے نیچے سریر (کھجور کی شاخوں کی چٹائی) پھیلاتے تھے۔ اسے دیوان کہا جاتا تھا جس پر شرفاء دو زانو بیٹھتے تھے۔ چہار زانو نشست کو فرعونی کہا جاتا تھا۔ عوام مٹی کے چبوترے پر کھجور کے پتوں سے بُنی ہوئی چٹائیاں بچھا لیتے تھے۔ اسے صُفّہ کہا جاتا تھا۔ ہمارا صوفہ صُفّہ ہی کی ایک صورت ہے۔

ہندوستان میں ایرانی وضع کی مسند بچھائی جاتی تھی اور دیوان تیار کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ملاقات کے کمرے یا مردانہ کو دیوان خانہ کا نام دیا گیا۔ حاضرین میں بزرگ ترین شخص صدر کی نشست پر گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھتا تھا۔ اُسے صدر نشین کہتے تھے۔ نَووارد سامنے آتے ہی تسلیم بجا لاتا۔ صاحبِ خانہ آگے بڑھ کر اُس کا خیر مقدم کرتا اور اُس کے مرتبے کے مطابق اُسے مناسب نشست پر بٹھا دیا جاتا تھا۔ محفل میں اُونچی آواز میں باتیں کرنا یا کھلکھلا کر ہنسنا معیوب تھا۔ شرفاء مسکرانے پر اکتفا کرتے تھے۔ جب تک بولنے والے کی بات ختم نہ ہو جاتی کوئی اُسے بیچ میں ٹوکتا نہیں تھا۔ جب تک بزرگ کوئی بات نہ پُوچھتے نوجوان چپ چاپ مؤدب بیٹھے رہتے تھے۔ مہمانوں کو پان اور حقّے پیش کئے جاتے تھے۔ صاحبِ خانہ مہمان کو رخصت کرتے وقت فرش کے کنارے تک جاتا تھا یا دروازے تک مشایعت کرتا تھا۔ یونانِ قدیم میں نوجوان اُمراء ہیٹرا اور جاپان

میں گیشاؤں کی صحبت میں جو اونچے درجے کی طوائفیں تھیں شائستگی کے طور طریقے سیکھنے جاتے تھے۔ دلّی اور لکھنؤ کے امراء اپنے بیٹوں کو آدابِ محفل سکھانے کے لیئے ڈیرہ دار طوائفوں کے کوٹھے پر بھیجا کرتے تھے۔ ملازموں کو تالی پیٹ کر بلایا جاتا تھا۔

ہندوستان میں مُنج کی چارپائی پر بیٹھتے تھے۔ سنیاسی اور سادھو ہرن یا شیر کی کھال پر سمادھی میں بیٹھا کرتے تھے۔ اِن کے علاوہ کسی بھی جانور کی کھال پر بیٹھنا معیوب تھا۔ مطرہ (چٹائی جس پر کڑھائی کا کام کیا گیا ہو) اور بساط یا دری پر بیٹھنے کا رواج ایران سے آیا۔ مغلیہ عہد میں فرش چاندنی کا رواج ہوا جس کی ایجاد نورجہاں سے منسوب کی جاتی ہے۔ چاندنی بچھا کر اُس پر گاؤتکیے اور پیک دان رکھ دیئے جاتے تھے۔ پاندان اور حُقّہ ہر وقت موجود رہتا تھا۔ ایک کونے میں رکھی برنجی انگیٹھی میں بخور سُلگتا رہتا تھا۔

●

طبقاتِ معاشرہ

زرعی انقلاب کے بعد ریاست صورت پذیر ہوئی جس کے ساتھ معاشرۂ انسانی مختلف طبقات میں بٹ گیا۔ بادشاہوں اور اُن کے حاشیہ نشینوں نے اقتدار پر قبضہ جما لیا۔ محنت کش کاریگر اور کسان اُن کے لیے عیش و عشرت کے سامان فراہم کرنے پر مامور ہوئے۔ اِس طرح دو بڑے طبقات معرضِ وجود میں آ گئے: سلاطین، اُمراء اور پروہتوں کا طفیل خوار مقتدر طبقہ اور محنت کش عوام جن کا استحصال وہ کرتے تھے۔ قدیم مصر میں فرعون، اُس کے درباریوں اور پروہتوں کا سب سے طاقتور طبقہ تھا۔ اُن کے بعد بتدریج گوالے، سوٗر چرانے والے، تاجر، ملاّح اور کسان آتے تھے۔ کنفیوشس نے چین میں جس معاشرے کی طرح ڈالی اُس میں عالموں کی عظمت قائم کی۔ وہ حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ ان کے بعد کسان، کاریگر اور تاجر آتے تھے۔ تاجروں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا کیوں کہ کاریگر اور کسان محنت مشقت کر کے روزی کماتے ہیں جب کہ تاجر اجناس اور مصنوعات کا محض تبادلہ کر کے دولت سمیٹ لیتے ہیں۔ جاپانی سماج میں سمورائی یا فوجی سردار شرفاء میں شمار ہوتے تھے کیوں کہ وہ شہنشاہ کے مقرّب تھے اور فوج کی قیادت کرتے تھے۔ اُن کے بعد کاریگر، کسان اور غلام آتے تھے۔ عرب تجارت کو شریف ترین پیشہ سمجھتے تھے اور کسانوں کو حقیر جانتے تھے۔ یحییٰ برمکی سے ایک قول منسوب ہے۔ وہ سلاطین و اُمراء کو سب پر فضیلت دیتا ہے۔ اُن کے بعد علماء، کسانوں اور تاجروں کا درجہ ہے، باقی رہے عوام تو وہ کالانعام (ڈھور ڈنگروں کی مانند) ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ظرافت (کلچر یا تہذیب و شائستگی، عربی میں مہذب

آدمی کو ظریف کہتے تھے) اعلیٰ طبقے سے خاص ہے۔ یہودیوں نے مصریوں سے طبقاتی تفریق اخذ کی تھی اِس لیئے قدرتاً اُن کے ہاں ربانی سب سے برتر تھے۔ ساسانیوں کے دورِ حکومت میں ایرانی معاشرہ چار طبقات میں منقسم تھا: بادشاہ اور اُس کے وزراء، صوبہ دار اور دبیرانِ سلطنت، مُوبد اور ہیربذ۔ چوتھا طبقہ اہلِ حرفہ اور دہقانوں کا تھا۔ یہ تقسیم جاگیرداری اور شاہی استبداد کے اصولوں پر مبنی تھی۔ صوبہ دار اور مرزبان ــــ سرحدی صوبوں کے حاکم ــــ بھی شاہ کہلاتے تھے۔ بادشاہ گویا شاہوں کا شاہ یا شہنشاہ تھا۔ عُلماء میں افضل درجہ داد وروں کا تھا، اُن کے بعد مُوبد آتے تھے۔ ان سب کا پیشوا موبدِ موبداں تھا جو اس پہلو سے بڑا طاقتور تھا کہ بادشاہ کے سر پر وہی تاج رکھتا تھا۔ نُجباء اور عوام کے درمیان وسیع خلیج حائل تھی۔ وسطی زمانوں کے مغربی ممالک میں جاگیرداری نظام قائم تھا۔ ہندوستان میں مُغلوں نے منصب داری نظام جاری کیا۔ بادشاہوں، جاگیرداروں، منصب داروں اور پروہتوں کی گرفت عوام پر بڑی مضبوط تھی۔ آج کل ہمارے ہاں جاگیردار اور صنعت کار اعلیٰ طبقے میں شمار ہوتے ہیں اور تاجر، مزارعہ ــــ یوسف زیوں کے علاقے میں مزارعین کو فقیر کہا جاتا ہے ــــ اور اہلِ حرفہ کا مرتبہ کمتر ہے۔ اہلِ حرفہ کو کمیّن یا کمینہ (لغوی معنیٰ کام کرنے والا) کہتے ہیں۔ اِن میں لوہار، ترکھان، موچی، نائی، کمہار، ماچھی وغیرہ شامل ہیں۔

ہندوستان میں ذات پات کی تفریق رنگ (ورن) کی بنا پر کی گئی تھی۔ ذات عربی زبان کا لفظ ہے، ہندی میں جاتی ہے۔ آریا حملہ آوروں نے جو گورے چٹے تھے سیاہ فام دراوڑوں کو شودر (لغوی معنیٰ غُلام یا خدمت گار) کہہ کر اُن کی گردن میں ابدی اور موروثی غلامی کا طوق ڈال دیا۔ ذات پات کا اِدارہ برہمنوں نے قائم کیا تھا اِس لیئے قدرتاً اُنہوں نے اپنے آپ کو بلند ترین مقام دیا۔ دوسرا طبقہ کھشتریوں یا سپاہیوں کا تھا۔ ویش کھیتی باڑی اور بنج بیوپار پر مامور ہوئے، شودروں ــــ بعد کے اچھوت، پیریا ــــ کے سپرد میلا اُٹھانے کا کام کیا گیا۔ برہمنوں نے اِس غیر فطری تمیز کو مقدّس بنا دیا۔ رگ وید میں

ذات پات کا کہیں بھی ذکر نہیں ملتا۔ منوسمرتی میں اِسے ناقابلِ تغیر محکم نظامِ معاشرہ بنا دیا گیا۔ منُو نے برہمن کو دیوتا کا مقام دیا ہے جس کی پوُجا دوسری جاتیوں پر فرض ہے۔ منوسمرتی میں کہا گیا ہے کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہے سب برہمن کی ملکیت ہے۔ اِس کے ضابطۂ قوانین کی ایک شق ہے " ذات پات کی مخالفت کرنے والے واجب القتل ہیں"۔ گوتم بدھ اور مہاویر نے ذات پات کی مخالفت کی تھی اس لئے برہمنوں نے اُنہیں کبھی معاف نہیں کیا اور ان مذاہب کو ہند میں نیست و نابود کر کے دم لیا۔ برہمن مسلمانوں سے اسی بنا پر سخت نفرت کرتے ہیں کہ اُن کی آمد سے ہندوستان میں برہمن کی برتری کو ٹھیس لگی تھی۔

منُو کہتا ہے کہ برہمنوں اور دیوتاؤں کی پوُجا کر کے سیلاب، قحط، وبا وغیرہ آفات کو ٹالا جا سکتا ہے " راجہ پر واجب ہے کہ وہ صُبح سویرے جاگتے ہی برہمنوں کی پوُجا کرے"۔ برہمنوں کو پانچ چیزوں کا نذرانہ دینا ضروری ہے: سونا چاندی، اراضی، کپڑا، غلّہ، گائے۔ اِسے پنچ دان کہتے ہیں۔ برہمن کو کچھ دیا جائے تو اُس پر احسان نہیں ہوگا بلکہ وہ اُسے اپنا حق سمجھ کر وصول کرے گا۔ یگیہ صرف برہمن ہی کر سکتا ہے، برہمن شرادھ کی رسوم ادا نہ کرے تو مُردے کی روح نرک میں جائے گی۔ برہمن خواہ قتل کر دے اُسے موت کی سزا نہیں دی جائے گی۔ کوئی شودر (اچھوت) کسی برہمنی کے ساتھ بدکاری کرے تو اُس کو جان سے مار دیا جائے لیکن برہمن کسی شُودر عورت کے ساتھ زنا بالجبر کرے تو اُس کے لئے منتر گایتری کا ایک سَو تک ورد کرنا کافی سزا ہوگی۔ جو شُودر کسی برہمن کے برابر بیٹھے یا "پاد مارے" تو اُس کے چوتڑ کاٹ دیئے جائیں۔ جس شُودر کا سایہ برہمن پر پڑ جائے اُسے جان سے مار دیا جائے۔ کوئی شُودر کسی اُونچی جاتی کے آدمی سے گستاخانہ لہجے میں بات کرے تو اُس کے حلقوم میں لوہے کی میخ ٹھونک دی جائے۔ کوئی شودر کسی برہمن کو دُور سے آتا ہوا دیکھے تو اُسے باخبر کرنے کے لئے چیخ مارے اور دور بھاگ جائے۔ آج بھی شُودر نہ گاؤں کے کنوئیں سے پانی بھر سکتا ہے نہ مندر میں داخل

ہو سکتا ہے۔ برہمن کہتے ہیں کہ برہمن اور اچھوت کا ملاپ ایسا ہی ہے جیسے کستوری کو پیاز کے ساتھ ایک جگہ رکھنا۔

برہمن کہتے ہیں کہ کھشتریوں کی جاتی خانہ جنگیوں میں لڑ بھڑ کر ختم ہو چکی ہے۔ راجپوت وسط ایشیا سے آنے والے ہنوں اور سیکھتیوں کی اولاد ہیں جن کے ہاتھوں برہمنوں نے بودھوں کا قتلِ عام کرانے کے لئے اُن کا شجرۂ نسب سورج اور چاند سے جا ملایا۔ آج کل کے کھتری اصلاً ویش ہیں کھشتری نہیں ہیں۔ ان کی گوتیں ہیں (۱) چار جاتی (۲) بارہ جاتی (۳) باون جاتی۔ چار جاتی ہیں سیٹھ، ملوترا، کھنّہ اور کپور۔ بارہ جاتی و چوپڑا، سہگل، ککڑ، مہتہ وغیرہ۔ باون جاتی بھنڈاری، سیٹھی، ہوری، ساہنی، انند، بھسین، سوڈھی، بیدی، بھلّہ وغیرہ۔ برہمنوں کی بھی کئی گوتیں ہیں۔ شمال مغربی ہند اور کشمیر کے گورے چٹے برہمن نسلی اختلاط سے بڑی حد تک محفوظ رہے ہیں اور وہ جنوبی ہند کے کالے برہمنوں کو صحیح النسل نہیں سمجھتے۔ جہاں تک مردم شماری کا تعلق ہے شودر یا اچھوت غالب اکثریت میں ہیں اور زیادہ تر جنوبی ہند میں مقیم ہیں۔

اچھوتوں کو ہری جن کہنے یا آئین میں اُنہیں مساوی حقوق دینے سے قدیم تعصبات میں کچھ بھی فرق نہیں پڑا۔ جب تک ہندوستان کی باگ ڈور برہمنوں کے ہاتھوں میں ہے اچھوتوں کی شرمناک غیر انسانی موروثی غلامی کا انسداد ممکن نہیں ہو سکتا۔ بارے اُچھوتوں کو اپنے انسانی حقوق کا شعور ہو گیا ہے۔ جنوبی ہند میں اُونچی جاتیوں کے تسلط سے آزادی حاصل کرنے کی جدّوجہد شروع ہو چکی ہے۔ برہمنوں کی برتری ختم ہو رہی ہے۔ ہندو عورتوں کے خیال میں کوئی کام شروع کیا جائے تو جو شخص پہلے سامنے آئے اُس کا اثر کام پر پڑتا ہے۔ اِس اثر کو پوکھا کہتے ہیں۔ برہمن کا پوکھا منحوس اور چوہڑے چمار کا پوکھا مبارک سمجھا جاتا ہے۔ اب برہمن کے لالچ، چٹورپن اور برتری کی اُلجھن کا ہر کہیں مذاق اُڑایا جاتا ہے۔

زرعی انقلاب کے بعد صورت پذیر ہونے والے معاشروں میں دو بڑے طبقات ابھرتے رہے۔ آقا اور غلام، جاگیردار اور مزارعہ یا کھیت مزدور۔ اِن طبقات میں صدیوں سے کشمکش جاری رہی۔ غلاموں اور مزارعین کی طرح مزدور بھی کارخانے دار کی غلامی کا جوا گردن سے اُتار پھینکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ طبقاتی کشمکش شخصی املاک کے اِنسداد کے ساتھ اِشتراکی ممالک میں ختم ہو چکی ہے کیوں کہ ان میں اجتماعی طریقۂ پیداوار کے رواج پانے سے اِستحصال کا خاتمہ ہو چکا ہے، قدیم طبقات مٹا دیئے گئے ہیں اور سب لوگ مساوی طور پر مل کر معاشرے کی فلاح و بہبود کے لئے کام کر رہے ہیں۔

تفریحات

گانا، بجانا اور ناچنا صبحِ تاریخ سے انسان کی محبوب تفریح رہی ہے۔ امیر غریب سب اپنے فراغت کے اوقات کو بہلانے کے لئے گاتے بجاتے رہے ہیں۔ پرندوں کو گاتے ہوئے سُن کر قدیم انسان نے بھی اپنے حلق سے سُریلی آوازیں نکالی ہوں گی اور کھوکھلے نرکل میں پھونک مار کر بنسری کی پیش قیاسی کی ہوگی۔ بول چال نے اُسے لب گویا عطا کیا تو وہ اپنے پیار محبت، بچھڑے ہوئے ساتھیوں کے شوقِ ملاقات اور آباء کے بہادرانہ کارناموں کو گیتوں میں بیان کرنے لگا۔ اس نوع کے بے شمار لوک گیت ضبطِ تحریر میں نہ لائے جا سکے اور تلف ہو گئے۔ جیسے ہمارے دیہات کا لوک ورثہ تغافل کا شکار ہو کر مٹتا جا رہا ہے۔

تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ تین قسموں کے ساز بنائے گئے (۱)۔ پھونک کے ساز مثلاً گھگھو، ونجھلی، جوڑی، بنسری، الغوزہ (۲)۔ تار کے ساز: بھیڑ بکری کے رودے خشک کر کے اُنہیں لکڑی کے ڈھانچوں یا کدو پر کس کر تار کے ساز بنائے گئے جو گز یا مضراب سے بجائے جاتے تھے مثلاً اِکتارہ، تومبا، وین، عُود، چنگ، سارندہ وغیرہ (۳)۔ کھگ کے ساز: لکڑی یا دھات کے خول پر چمڑا منڈھ کر بنائے گئے مثلاً ڈھول، ڈھولک، مردنگ، پکھاوج، طبلہ، دائرہ جو لے کے ساز ہیں اور سُروں میں ضبط پیدا کرتے ہیں۔ سازوں کی یہ قسمیں کسی نہ کسی صورت میں تمام اقوامِ عالم میں مقبول رہی ہیں۔

عربوں کے ہاں موسیقی (یونانی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا معنیٰ ہے، جس کا تعلق فن کی دیویوں میوزز سے ہو") کا تعلق نظریے یا علم سے ہے اور یہ ریاضی کی ایک شاخ ہے۔ گانے یا الحان کو غنا کہتے ہیں یعنی "آواز جو طرب انگیز ہو"۔ دھنیں بنانے والا موسیقار کہلاتا ہے اور گانے بجانے والے کو مُغنی یا مطرب کہتے ہیں۔ سنسکرت میں سُر کا معنیٰ ہے الشور اور تال تالی پیٹنے سے ہے۔ ہندو سُر کو الشور اور تال کو گورو کہتے ہیں۔ اُن کے بقول جو شخص گورو کے سامنے زانوائے ادب طے نہ کرے وہ سُر یا الشور تک نہیں پہنچ سکتا۔ جو آدمی تال یا لے کا کچا ہو اُسے عطائی کہتے ہیں۔ عربی میں سُر کو لحن اور تال کو الیقاع کہا گیا ہے۔

عربی موسیقی اصلاً عجمی ہے۔ خسرو پرویز کے درباری گویوں باربد اور نکیسا نے ایرانی موسیقی کو بامِ کمال تک پہنچا دیا۔ نو مُسلم عجمیوں نے ایرانی دُھنوں کو عربی اشعار میں منتقل کیا۔ اکابر مُغنی سیاط، فلیح، زلزل، ابراہیم موصلی، اسحٰق موصلی، طویس، زریاب سب عجمی تھے۔ راگوں کی ترتیب کو عربی میں تالیف الالحان اور فارسی میں علم پردہ کہتے ہیں۔ ناچنے گانے والیاں بنات الہوا اور سازندے آلاتی کہلاتے تھے۔ آلات موسیقی میں بربط، دف، چنگ، نَے یا مزمار، شہنائی، کاسہ، صنج، کمنچہ، طنبورہ، شہرود، قانون اور شاباق عام طور سے بجائے جاتے تھے۔ کوس، طبل، نقارہ، قرنا، نرسنگھا، بُوق، نفیر جنگی باجے تھے۔ زریاب نے عود میں پانچویں تار کا اضافہ کیا اور عقاب کے ناخن کی مضراب بنائی۔ عُود کے چار تار انسان کے چار مزاجوں کی رعایت سے لگائے گئے تھے۔ عُود کے پردوں کو فرلیں کہتے تھے۔ بنو اُمیہ اور بنو عباس کے عہد حکومت میں قوذ، دنانیر، منت، عریب، بذل، قند اور زرقا نے گانے بجانے میں کمال پیدا کیا۔ ان میں سے بعض کنیزیں ایسی صاحب کمال تھیں کہ گویّے بھی اُن پر رشک کرتے تھے۔

عُود بجانے والے کو عُودی، چنگ بجانے والے کو چنگی اور نَے (بنسری) بجانے والوں کو نائی کہتے تھے۔ ہندوستان کے سازوں میں وین ایک قدیم اور نہایت مشکل ساز ہے جس کے سروں پر دو تونبے لگے ہوتے ہیں جن میں سے آواز گمک بن کر تاروں پر تھرتھراتی ہے۔ ونچبلی نرٹ جوڑی، کنگ اور اکتارا دراوڑوں سے یادگار ہیں۔ قدیم یونان اور کریٹ میں بھی المعوزا بجایا جاتا تھا۔ سُرمنڈل اور تانپورا گانے کے ساتھ چھیڑتے ہیں۔ ستار مختلف صورتوں اور ناموں سے کئی قدیم اقوام میں مقبول تھا۔ تال کے سازوں میں پکھاوج، مِردنگ، ڈھول، ڈھولک اور طبلہ قابلِ ذکر ہیں۔ پکھاوج پُرانے زمانے کی مِردنگ کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ کھرتال اور منجیرا بھجنوں کے ساتھ مندروں میں بجاتے ہیں۔ دوسری اقوام کی طرح ہندوستان میں بھی گانے بجانے کا آغاز مندروں سے ہوا تھا۔ چنگ تاتاریوں کا اور سارندا پٹھانوں کا ساز ہے جسے گز سے بجاتے ہیں۔ ان کے علاوہ رباب، قنارا، قصاب اور دف ایران اور خراسان سے آئے تھے۔ سارنگی کی ایجاد سارنگ خاں سے منسوب ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کے تاروں کی آواز سب سے زیادہ انسانی آواز کے مُشابہ ہے۔

سازینہ یا آرکسٹرا سب سے پہلے ہارون الرشید کے عہد میں ترتیب دیا گیا۔ اُس کے سامنے عُود، چنگ، صَنج اور دف بجانے والی کنیزیں اپنے اپنے ساز لے کر الگ الگ پرے باندھ کر کھڑی ہو جاتی تھیں اور باری باری یا مِل کر اپنے اپنے ساز بجاتی تھیں۔ کتاب الاغانی میں اس کی تفصیل دی گئی ہے۔ ایک دفعہ سازینہ کی ایک کنیز نے تار غلط بجایا تو اسحٰق موصلی نے اُس کی غلطی پکڑ لی تھی۔ ایک ماہر موسیقار ہاتھ میں قضیب (چھوٹی سی چھڑی) لئے اُس کے اشاروں سے کنیزوں کو ہدایت دیا کرتا تھا جیسا کہ مغرب کے آرکسٹرا میں کنڈکٹر کرتا ہے۔ بعد میں سازینہ کا یہ اسلوب دوسرے ممالک میں بھی رواج پا گیا۔

مغربی موسیقی کا باقاعدہ آغاز اٹھارویں صدی میں پیانو اور وائلن سے ہوا۔ وائلن کو موجودہ شکل ایک اطالوی سٹریڈی ویریس نے دی۔ پیانو پہلے سپنٹ کہلاتا تھا۔ ایک اطالوی نے اس میں ایک پرزے کا اضافہ کیا جس سے اُس کی آواز میں زیر و بم پیدا ہو گیا۔ اطالوی زبان میں مدہم آواز کو پیانو اور اُونچی آواز کو فورتے کہتے ہیں چنانچہ سپنٹ کا نام پیانو فورتے پڑ گیا جو بدل کر پیانو فورت اور مخفف ہو کر پیانو کہلایا۔ ایک اطالوی گائڈو نے موسیقی کو ضبطِ تحریر میں لانے کا فن دریافت کیا۔ مغرب کی کلاسیکی موسیقی کا آغاز باخ سے ہوا جس کے مذہبی نغمے آج بھی دلچسپی سے سُنے جاتے ہیں۔ موتسارت نے اِس موسیقی کو زیادہ دلکش بنایا اور بیٹ ہوون نے اِسے بامِ کمال تک پہنچا دیا۔ باخ کے بعد دو صدیوں تک جو موسیقی تخلیق ہوئی اُسے کلاسیکی کے بجائے جرمن موسیقی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اِس دوران میں جرمنی کی خاک سے شوبرٹ، ہین، ہینڈل اور واگنر جیسے باکمال اُٹھے۔ آج کل یورپ میں ڈسکو اور پاپ کا دَور دورہ ہے جس کی ہیجان آور دُھنیں جوان خُون میں آگ لگا دیتی ہیں۔ اِس کے لئے خاص قسم کے ساز بجائے جاتے ہیں جن میں سے بعض حبشی موسیقی سے ماخوذ ہیں۔ گانے بجانے والے اور سُننے والے بے اختیار تھرکنے لگتے ہیں۔ موسیقی اور ناچ ایک دوسرے میں گھُل مِل گئے ہیں۔

پٹھان اور مُغل سلاطین موسیقی کے بڑے سرپرست تھے اور اُن کے درباروں سے نامور گویّے اور سازندے وابستہ تھے۔ گانے والیاں ناؤ نوش کی محفلوں کو گرماتی تھیں۔ حرم سراؤں میں بھی گانے بجانے کی محفلیں برپا کی جاتی تھیں جنہیں نوبت خاتون کہتے تھے۔ ابوالفضل نے سیزدہ تالن (تیرہ تالن) کا ذکر کیا ہے جن کے گانے بجانے کا انداز دلچسپ اور مخصوص تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ گانے والیاں بہ یک وقت تیرہ تالوں میں گاتی تھیں۔ دو گھنگھرو کلائیوں پر، دو کہنیوں پر، دو کندھوں کے جوڑوں پر، دو کندھوں پر، دو دو ہاتھوں کی انگلیوں میں، ایک چھاتی پر لگا ہوتا تھا۔ یہ عورتیں مالوہ اور

گجرات سے آتی تھیں۔

قدیم انسان کا فتح اور خوشی کی ترنگ میں بے اختیار سر مارنا اور تھرکنا قابلِ فہم ہے۔ مرورِ زمانہ سے تمدن میں فروغ کے ساتھ ناچ میں تکلف اور نزاکت آگئی۔ غاروں کے انسان کی اُچھل کُود اور والز جیسے پیچیدہ رقص کے درمیان اَن گنت صدیوں کا وقفہ ہے۔ قدیم مصر میں کنیزیں مادر زاد برہنہ ناچا کرتی تھیں جیسا کہ کھنڈروں کی دیواری تصویروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ مصرِ جدید کی عالمہ (گانے والی)، غازیہ (ناچنے والی) کے گیتوں اور ناچ میں قدیم مصری ناچ گانے کی روایات زندہ ہیں۔ غازیہ کُولھے پھڑکا پھڑکا کر اِس جوش و خروش سے ناچتی ہے کہ دیکھنے والے مست و بے خود ہو جاتے ہیں۔ غوازی (جمع غازیہ) خاص محفلوں میں برہنہ بھی ناچتی ہیں۔ اِن کا "رقصِ شکم" دنیا بھر میں مشہور ہے۔ مصر میں ناچنے والے مرد کو کرج کہتے ہیں۔ مردوں کے ناچنے کی روایت بھی بہت پرانی ہے۔ سموئیل میں آیا ہے[1]

"داؤد خداوند کے حضور اپنے سارے زور سے ناچنے لگا۔"

ہندوستان قدیم میں ناچنے والے مرد کو نٹ اور عورت کو نٹنی کہتے تھے۔ ہندوستان کا بھرت نیٹم دراوڑوں سے یادگار ہے۔ شروع شروع میں یہ ناچ عورتوں کا تھا جسے بعد میں مردوں نے اختیار کر لیا۔ منی پوری ناچ سنتھالوں اور کتھا کلی بھیلوں سے لیا گیا ہے۔ قدیم زمانے میں نرت کے کمال دکھانے والی کو نرتکی کہتے تھے جو آنکھوں، بھووؤں اور ہاتھ کی انگلیوں کے اشاروں سے مختلف جذبات کی ترجمانی کیا کرتی تھی۔ بھاؤ بتانے کی روایت لکھنؤ میں سرسبز ہوئی۔ اجودھیا اور بنارس ناچ اور سنگیت کے بڑے مرکز تھے جہاں کتھک ناچ کی تربیت دیتے تھے۔ رہس دھاری پیشہ ور رقاص تھے اور ہندو تھے جن کی پرورش متھرا اور برج میں ہوئی تھی۔ جانِ عالم نے اِن کی نئے سرے سے تربیت

[1] عہد نامۂ قدیم

کی تھی۔ شاہی سبھا میں پریوں کی بھبوت کے لئے پنیریوں تلے موتی جلائے جاتے تھے۔ رہس میں ناچنے والیوں کی کئی ٹکڑیاں تھیں: جھومر والیاں، ایک نتھ والیاں یا کنواری اچھوتیاں، گھونگھٹ والیاں، نقل والیاں وغیرہ۔ کشمیری بھانڈ مسلمان تھے جو رقص و نقالی کے ماہر تھے۔ ان کے طائفوں میں دس اداکار ہوتے تھے۔ ایک خوبصورت لڑکا جس کے بال کمر تک لٹکتے تھے پاؤں میں گھنگھرو باندھ کر ناچتا تھا۔ درگا پرشاد کے بیٹوں کالکا اور بندادین پر رقص اور نرت کا خاتمہ ہو گیا۔ کشمیری رقاصوں میں کھلونا، وارث، علی جان کا رقص میں نے دیکھا تھا۔ مشتری اور زہرہ لکھنؤ کی مشہور ناچنے والیاں تھیں۔ گوہر گانے اور نرت میں بے نظیر تھی۔ جدن کو مور نکھی (مور کا ناچ) میں کمال حاصل تھا[1]۔ کتھک ناچنے والے بڑے ہر دلعزیز تھے۔

مغرب کے ناچوں میں والز رقص سب سے بلند پایہ ہے۔ یہ رقص آسٹریا کے دارالسلطنت وی آنا میں پروان چڑھا تھا۔ اس میں پیار کی ابتدائی کشش سے لے کر نقطۂ عروج تک کے مختلف پیچیدہ مراحل کی اُستادانہ ترجمانی کی جاتی ہے۔ ہسپانیہ کا ناچ فان دانگو نہایت ہیجان آور اور ہوس پرور ہوتا ہے۔ جاز، ٹانگو اور شیک جیسے ناچ حبشیوں کے ناچوں سے مستعار ہیں۔ ان میں چھاتیوں اور کولہوں کی جنبش پر زور دیا جاتا ہے۔ برصغیر ہند و پاک کے لوک ناچ بڑے دلچسپ ہیں۔ ان میں مختلف موسموں اور جذبوں کی عکاسی کی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں بھنگڑا پنجاب کا اور خٹک صوبۂ سرحد کے معروف مردانہ ناچ ہیں جو ازبکوں، کرغیزوں اور قزاقوں کے ناچوں سے ملتے جلتے ہیں۔ سکھ اور مسلمان گبھرو چیرے اور لاچے باندھ کر بیساکھی کے تہوار پر ڈھول کی تال کے ساتھ بھنگڑا ناچتے ہوئے میلے پر آتے ہیں۔ بھنگڑا ناچتے ہوئے ڈھولوں کی بدلتی ہوئی تالوں کے ساتھ ناچ کی حرکات بدلتے جاتے ہیں۔ ہمارے دیہات میں چاندنی راتوں میں نوجوان عورتیں کِکلی، گِدا، سمّی ناچتی ہیں۔ ان کے ساتھ

[1] یادِ ایام۔ عبد الرزاق کانپوری

گیت بھی گائے جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں لوک ناچ مناسب ہمت افزائی اور سرپرستی نہ ہونے کے باعث مٹتے جا رہے ہیں۔ اشتراکی اقوام نے اپنے اپنے لوک ورثے کو نہ صرف محفوظ کیا ہے بلکہ اُسے فروغ بھی دے رہی ہیں۔

انسان شکار، چوگان اور گھوڑ دوڑ کی مردانہ کھیلوں سے بھی جی بہلاتا رہا ہے۔ شاہانِ ایران گورخر اور ہرن کا شکار بڑے شوق سے کھیلتے تھے۔ اسی نسبت سے ایک بادشاہ کا نام بہرام گور پڑ گیا۔ ایرانیوں اور مغلوں کا ایک محبوب مشغلہ یہ تھا کہ میلوں تک آدمیوں کا حلقہ بنا کر شکار کے جانوروں کو گھیرے میں لے لیتے تھے اور پھر شکار کھیلتے تھے۔ اسے شکار قرغہ کہتے تھے۔ اشوریا کے بادشاہ رتھ میں بیٹھ کر تیروں سے شیر مارتے تھے۔ علی قلی خاں شیر افگن اور فرید خاں (بعد کا شیر شاہ) نے تلوار سے شیر مار گرائے تھے۔

عرب چیتے کے شکار کے دلدادہ تھے۔ پرندوں کا شکار باز سے کھیلتے تھے جیسا کہ آج کل کے عرب شیوخ کا شغل ہے۔ ہندوستان میں مغل سلاطین ہاتھی پر بیٹھ کر شیر کے شکار کو جاتے تھے۔ ملکہ نور جہاں قدر انداز تھی۔ ایک دفعہ جہانگیر شکار کے لئے جنگل کو گیا۔ نور جہاں ہمراہ تھی۔ ایک شیر کچھار سے نکل کر اُن کے ہاتھی پر جھپٹا۔ شاہی بندوقچی فولاد خاں کا نشانہ خطا گیا۔ نور جہاں نے پہلی گولی سے شیر کو ڈھیر کر دیا۔ انگریزوں کا دور آیا تو مچان پر بیٹھ کر بندوق سے شیر کو شکار کرنے کی رسم چل نکلی۔ نواب اور مہاراجے کسی سرکس کا شیر جنگل میں چھوڑ دیتے اور صاحب بہادر اُسے مار کر اپنی بہادری کا چرچا کیا کرتے تھے۔

انگلستان، آئرلینڈ اور ہمارے ملک میں تازی کتوں سے خرگوش اور لومڑی کا شکار کھیلا جاتا ہے۔ ان کتوں کے بڑے چونچلے کئے جاتے ہیں۔ مرغ بازی، کتے لڑانے اور پتنگیں

اُڑانے کے کھیل دنیا بھر کے ممالک میں مقبول رہے ہیں۔ بٹیر بازی خاص پنجاب کا کھیل تھا یہیں سے اودھ اور دِلّی کو گیا کبوتر بازی کو جلال الدین اکبر نے عشق بازی کا نام دیا تھا۔

گھوڑ دوڑ عربوں کا اور چوگان ایرانیوں کا محبوب مشغلہ تھا۔ گھوڑے شرطیں بد کر دوڑائے جاتے تھے۔ عربوں کے واسطے سے چوگان یورپ تک پہنچ گیا۔ آج کل اِسے پولو کہا جاتا ہے۔ خسرو پرویز اور اِس کی ملکہ شیریں چوگان کے شیدائی تھے۔ مغل شہزادیاں بھی چوگان کھیلنے کی شوقین تھیں۔

بیسویں صدی میں فٹ بال، ہاکی، ٹینس، بیس بال، کشتی رانی اور برف پر پھسلنے کے کھیل مقبول ہوئے۔ فٹ بال چین سے آیا تھا۔ کرکٹ اور ہاکی انگریزوں کی دین ہے۔ برف پر پھسلنے کا کھیل روس، ناروے، سویڈن اور سوئٹزرلینڈ میں شوق سے کھیلا جاتا ہے۔ اِن کھیلوں کے بین الاقوامی مقابلے کرائے جاتے ہیں۔ یونان قدیم کے اولمپک کھیلوں کے احیاء نے اِن مقابلوں میں غیر معمولی جوش و خروش پیدا کر دیا ہے۔

قدیم ہندوستان اور یونان میں ناٹک تفریح کا ایک عمدہ وسیلہ تھا۔ موسیقی اور ناچ کی طرح ناٹک نے بھی مذہب کے گہوارے میں پرورش پائی۔ اس میں پہلے پہل دیو مالائی قصّوں کی ترجمانی کی جاتی تھی، بعد میں ہر قسم کے موضوع بار پا گئے۔ یونان میں اسکیلس، سوفوکلیز اور یوری پیڈیز کے المیہ ناٹک بڑے بلند پایہ تھے جو دیوتا دائیونیسس کے معبد کے قریب تھیٹر میں دکھائے جاتے تھے۔ ایکٹر مُنہ میں دھات کی ایک پتّی رکھ کر مکالمے بولتے تھے جس سے آواز بلند تر ہو کر ناظرین تک پہنچتی تھی۔ کورس کا آغاز بھی یہیں سے ہوا۔ ارسطوفینیس نے فرحیئے لکھ کر طنز و مزاح کی روایت کی آبیاری کی۔ ہندوستان میں کالیداس کے ناٹک شکنتلا اور بھوبھوتی کے مالتی مادھو نے اعلیٰ معیار قائم کیا۔ ہندوؤں کے ناٹک فرحیئے ہوتے تھے۔ المیہ کی روایت مفقود تھی۔ اہلِ نظر کے خیال میں باختری یونانیوں سے

ہندوستان میں ناٹک کی روایت قائم ہوئی۔ تھیٹر کی روایت کہیں کہیں باقی و برقرار ہے لیکن اب فلمیں زیادہ مقبول ہیں۔ لوگ جوق درجوق منڈووں کا رُخ کرتے ہیں اور تھوڑی دیر کے لئے اپنے آپ کو ہیرو یا ہیروئن کے روپ میں تصوّر کرکے خوش وقت ہولیتے ہیں۔

کٹھ پتلیوں کا تماشا چین کی عطا ہے۔ عرب اسے خیال الظل یا چینی سائے کہتے ہیں۔ ترکوں نے قراگیوز کا نام دیا اور اسے مصر اور شمالی افریقہ کے ممالک میں رواج دیا۔ کٹھ پتلیوں کو پس پردہ رسیوں سے کھینچ کھینچ کر تماشا دکھاتے ہیں۔ ایک شخص ساتھ ساتھ کہانی بیان کرتا جاتا ہے۔ تاش کا کھیل بھی چین کی دین ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں: انگریزی باون پتّوں کا اور مغلئی بانوے پتّوں کا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں انگریزوں کے طریقے سے تاش کھیلتے ہیں۔ کلبوں اور جوئے خانوں میں برج، فلاش عام طور سے کھیلی جاتی ہے۔ تاش کے علاوہ شطرنج، نرد، پانسہ یا پچیسی کے کھیل پرانے وقتوں سے مقبول رہے ہیں۔ شطرنج اصل میں چتر انگ (چار پہلو) تھا جو ہندو راجاؤں کی فوج کے چار شعبوں پیدل، پیلا (فیل) گھوڑا سواروں اور رتھوں کی رعایت سے ایجاد کیا گیا۔ اس کی ایجاد سندھ کے ایک بودھ سوامی سسّہ سے منسوب ہے۔ نوشیرواں کا وزیر برزویہ اسے ایران لے گیا جہاں سے عربوں نے اسے مغرب تک پہنچا دیا۔ بنو عباس شطرنج کھیلا کرتے تھے۔ ہارون الرشید نے ہاتھی دانت کا ایک خوبصورت شطرنج شارلیمان شاہ فرانس کو بھجوایا تھا جو آج بھی پیرس کے ایک عجائب گھر میں محفوظ ہے۔ بعض سلاطین سونے کے جڑاؤ مہرے بنواتے تھے جن میں فیل، گھوڑے، رتھوں اور پیدلوں کی صورتیں بنوائی جاتی تھیں۔ ہندوستان کا منتری ایران جاکر فرزین (مشیر وزیر) بن گیا۔ اہل مغرب نے اسے ملکہ بنا دیا کیوں کہ ان کے دربار میں ملکہ بادشاہ کے ساتھ تخت پر بیٹھا کرتی تھی اور بڑی صاحب اختیار ہوتی تھی۔ اس کی ایک مثال فرڈیننڈ شاہ ہسپانیہ کی ملکہ ازابیلا پیش کرتی ہے۔ شطرنج کے مہروں کی چال معیّن ہے۔ بادشاہ پر کسی

مہرے کی زد پر پڑے تو کھیلنے والا آواز دیتا ہے "شہ" یا شکست اور بادشاہ کے لئے چال چلنے کا کوئی خانہ نہ رہے تو اسے شہ مات یا مات کہتے ہیں۔ بعض مغل بادشاہ زندہ شطرنج کھیلتے تھے۔ حسین کنیزیں ہتھیاروں سے مسلح مہرے بن کر اپنے اپنے خانوں میں کھڑی ہو جاتی تھیں اور تیغ زنی کے جوہر دکھاتی تھیں جب کوئی مہرہ پٹ جاتا تو اُس کی کنیز بساط سے باہر نکل جاتی تھی۔ شطرنج ایک نہایت پیچیدہ کھیل ہے جس کے عقدے سلجھانے پر بہترین دماغوں کا زور صرف ہوتا رہا ہے۔ آج کل روسی عورتیں مرد اس کے بہترین کھلاڑی سمجھے جاتے ہیں۔ اس کھیل پر بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

روایت کے مطابق نرد نوشیرواں کے وزیر بزرگ مہر کی ایجاد ہے اور ایران اور ترکیہ میں آج بھی مقبول ہے۔ ہندوستان میں چوسر کو پانسہ یا پچیسی بھی کہتے ہیں۔ اجنتا کے نقوش سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں یہ کھیل بہت مقبول تھا۔ راجے مہاراجے بازی بد کر کھیلتے تھے اور بعض اوقات اپنی سلطنت اور عورتیں تک ہار جاتے تھے۔ پچیسی چوگوشہ ہوتی ہے اور کوڑیاں پھینک کر گوٹوں سے چال چلتے ہیں۔

داستان گوئی یا قصہ خوانی کے مشغلے بھی قدیم زمانوں سے یادگار ہیں۔ کہانی کہنا ایک فن ہے۔ پیشہ ور قصہ گو اپنی چرب زبانی سے سامعین کو مسحور کر لیتے ہیں۔ عربوں میں اسے سامرہ کہتے ہیں۔ (سمر بہ معنی کہانی)۔ کہانی کہنے والا یا سامر سیرۃ عنتریہ بیان کرتا ہے تو سننے والوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے ہیں۔ سیرۃ عنتریہ مشہور ادیب اصمعی کی تالیف ہے جس میں اسلام سے پہلے کے ایک عرب سورما عنترہ بن شداد کے شجاعانہ کارنامے بیان کئے گئے ہیں۔ داستان گو مملوک سلطان رکن الدین بیبرس بندوق داری کی بہادری کے کارنامے بھی جو داستان کے رنگ میں بیان کئے جاتے ہیں نہایت ذوق و شوق سے سُنتے ہیں۔ اودھ میں داستان گوئی کا فن ایران سے آیا۔ راتوں کو داستان

گو طلسم ہوشربا یا داستان امیر حمزہ مزے لے لے کر بیان کرتے تھے اور اپنی رطب اللسانی سے سامعین پر جادو کر دیتے تھے۔

ہزاروں کا ایک مشغلہ خاص طور سے دلچسپ ہے۔ دو آدمی کسی محفل میں آمنے سامنے بیٹھ جاتے ہیں، ایک دوسرے پر پھبتیاں کستے ہیں اور جگت بازی سے اپنے حریف کو نیچا دکھانے کا جتن کرتے ہیں۔ جھنگ اور ملتان میں اسے وگتی کہتے ہیں۔ زمینداروں کے دیوان خانوں میں وگتی کے مقابلے کرائے جاتے ہیں۔ وگتی باز حریف کی بات سے بات پیدا کر کے اُس کی پگڑی اُچھالتا ہے۔ جو حریف لاجواب ہو جائے وہ ہار جاتا ہے۔ سامعین دونوں کی بھرپور چوٹوں پر جوش و خروش سے داد دیتے جاتے ہیں۔ ہر پھبتی پر داد و تحسین کا غلغلہ بلند ہوتا ہے۔ لوگ وگتی بازوں سے گھبراتے ہیں کہ فقرہ کس کر بھری محفل میں رُسوا نہ کر دیں۔

ہمارے ہاں مشاعرہ بھی تفریحی مشغلہ بن گیا ہے۔ شاعر باری باری اپنا کلام سُناتے ہیں اور سامعین سے توقع کرتے ہیں کہ اُن کے ہر شعر پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسائیں گے۔ مشاعروں میں اُستاد اپنے اپنے چیلوں کے جلو میں آتے ہیں اور صرف اپنے ہی دھڑے کے شاعر کو داد دیتے ہیں۔ مخالف دھڑے کے کسی شاعر کا کلام کتنا ہی اچھا ہو انہیں سانپ سونگھ جاتا ہے۔ مشاعروں میں اکثریت تُک بندوں کی ہوتی ہے جو بزعم خود میرؔ و غالبؔ کے ہمسر و ہمچشم ہونے کے مدعی ہوتے ہیں۔ اُستاد صاحبان بڑی تمکنت سے مسند پر بیٹھتے ہیں اور سرپرستانہ انداز میں چشم و ابرو کی خفیف جنبش سے داد دیتے ہیں۔ اِن کا آپس میں خفی قسم کا سمجھوتہ ہوتا ہے۔ جو انہیں کھُل کر داد دے اُسی کو داد دیتے ہیں جو نہ دے اُسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بعض تُک بند اپنے کلام کی پستی کو گلے بازی سے بلند کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن بسا اوقات شعریت

اور موسیقی دونوں کا خون کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات سامعین کی بے پناہ تمسخرانہ داد بیداد بن جاتی ہے۔ یہ منظر عبرت ناک ہونے کے ساتھ ساتھ مضحکہ خیز بھی ہوتا ہے۔ پرانے شاعر مشاعروں میں شرکت کے لئے موٹی رقمیں وصول کرتے ہیں۔ نو آموزوں کی تاک کھانے پر ہوتی ہے۔ اچھے کھانے، پان سگریٹ اور سفر کے کرائے ہی کو غنیمت سمجھ لیتے ہیں۔

دنیا بھر کے بچے کھیل کود کے رسیا ہوتے ہیں۔ لڑکپن کھیل کود ہی کا تو زمانہ ہوتا ہے۔ ہر قوم کے بچے اپنے اپنے ملک کے مخصوص کھیل کھیلتے ہیں، ہمارے ہاں کے بچوں اور بچیوں کے پسندیدہ کھیل: گڑے گڑیا کا بیاہ، آنکھ مچولی (بنگال کی کانی مکھی) چیل جھپٹا، باگھ بکری، دب دبولی، بھیڑ کڑا انگا، گلی ڈنڈا، قاضی مُلّا، سِت کدی، ٹھیکری مار، شاہ شٹا پو، ٹھنا ٹھال، گیڑیاں، چیچو چیچ گھچولیاں وغیرہ۔ بندر یا ریچھ والے کی ڈگڈگی یا سپیرے کی تونگی کی آواز کان میں پڑتے ہی بچے دوڑ کر گھروں سے گلی میں نکل آتے ہیں۔ بندر کا تماشا، سانپ کے کھیل اور ریچھ کا ناچ دیکھ دیکھ کر نہالوں نہال ہوتے ہیں۔ کبھی کبھار مداری آجاتے ہیں جو بچے جمورے پر چادر ڈال کر اُس کی موت اور دوبارہ زندہ ہوجانے کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ ان تماشوں میں بچے بوڑھے سب دلچسپی لیتے ہیں اور خوش ہو ہو کر تالیاں پیٹتے ہیں۔

تہوار

تہوار اور میلے ٹھیلے دو قسم کے ہیں: مذہبی اور موسمی۔ مذہبی تہواروں میں کسی مذہب کی مخصوص روایات کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ بعض تہوار اجتماعی ورثے سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ مجوسیوں کے دو مذہبی تہوار نوروز اور مہرگاں کے تھے جو بعد میں فصلی تہوار بن گئے۔ نوروز بہار میں اور مہرگاں (مہر: مِتھرا، سورج) سورج دیوتا کا تہوار تھا جو خزاں میں منانے لگے۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں[1]

"پارسی لوگ مہرگان کے دن عید کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آج کی رات گائے ظاہر ہوتی ہے، سونے کے سینگ، چاندی کے کُھر، ایک جلوہ دکھا کر غائب ہو جاتی ہے۔ جسے نظر آجائے اُس کا تمام سال عیش اور خوشحالی میں گذرتا ہے۔"

مجوسی نوروز کو جشن کی طرح مناتے تھے، بارہ روز کے لئے کاروبار معطل ہو جاتا، عورتیں مرد اپنے بہترین لباس پہنے باغوں میں گھومتے پھرتے تھے، دوست احباب ایک دوسرے کے گھر جاتے، دعوتیں دیتے، تحائف کے تبادلے ہوتے ندیوں کے کنارے شمشاد اور چنار کے درختوں تلے بیٹھ کر گاتے بجاتے پیتے پلاتے۔ ان ایام میں "سات سین" کھانے کا رواج تھا یعنی سیب، سیر، سمن (گھی)، سنجد (تل)، سمنو (مٹھائی)، سرکہ اور سبز (سبزی ترکاری)۔ ایک روایت کے مطابق یہ جشن جمشید نے پہلی بار منایا تھا۔ ہندوستان کے مغل سلاطین بھی بڑے جوش و خروش سے نوروز کا جشن مناتے تھے، نئے سکے ڈھلوائے جاتے، اُمراء بادشاہ کو نذریں دیتے۔

---

[1] سخندانِ فارس

بادشاہ کا تُلا دان ہوتا تھا۔ بادشاہ سونے، چاندی، ابریشم، خوشبویات، کپڑے، میوے، شیرینی، تیل وغیرہ میں تُلتا تھا اور یہ سب چیزیں مساکین کو دی جاتی تھیں۔

نئے سال کا جشن امریکہ اور یورپ میں بھی بڑی خوشیوں سے منایا جاتا ہے۔ اکتیس دسمبر کی رات کو گانے بجانے اور پینے پلانے کی محفلیں برپا ہوتی ہیں۔ عورتیں مرد شراب کے نشے میں دھت سازوں کی گت پر دیوانہ وار ناچتے ہیں جب بارہ بجتے ہیں تو چاروں طرف خوشی کے نعرے سُنائی دیتے ہیں۔ سازوں کی گت تیز تر ہو جاتی ہے اور شرم و حیا کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔

ایران میں فیروز جان کی عید پانچ روز تک مناتے تھے۔ اس کا آغاز ۲۶۔ ماہِ آبان سے ہوتا تھا۔ ان ایام میں مَرے ہوئے عزیزوں کی روحوں کی ضیافت کی جاتی تھی۔ ایامِ بہار میں جشن چراغاں منایا جاتا تھا جو روز اسفند (مارچ کے دوسرے دہاکے میں) ہوتا تھا۔ مصر میں قبطی نُوروز کی عید مناتے ہیں۔ یہودیوں کی سب سے بڑی عید الخطاب ہے۔ یہ تہوار اُس روز کی یاد میں مناتے ہیں جب خداوند یہواہ نے وادیٔ سینا کے پہاڑ سے بنی اسرائیل کو خطاب کیا تھا۔ اسلام سے پہلے عربوں کے ہاں عید کا دن یوم السبع کہلاتا تھا جسے وہ لہو و لعب میں گذارتے تھے۔

رومن کیتھولک اور مشرقی کلیسا والے سال میں کئی عیدیں مناتے ہیں۔ زیتونیہ کا تہوار روزوں کے ساتویں دن منایا جاتا ہے۔ اس تقریب میں کھجور کی ٹہنیاں لے کر گرجا سے باہر نکلتے ہیں۔ یہ تہوار جناب مسیح کے بیت المقدس میں گدھے پر سوار ہو کر جانے کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ ہفتۂ نور ایسٹر سے ایک دن پہلے مناتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس روز جناب مسیح کی قبر پر چراغ جل اُٹھے تھے۔ قدیم زمانے سے انڈا حیات، بقا اور بارآوری کی علامت رہا ہے۔ ایسٹر پہ انڈوں پر طرح طرح کے رنگ کر کے ایک دوسرے کے گھر بھیجتے ہیں تاکہ جیسے انڈے بلیں وہ اگلے ایسٹر تک خوشحالی میں بسر کریں۔ ایک انڈے سے دو زردیاں برآمد ہوں تو اسے خوش قسمتی کی علامت سمجھتے

ہیں۔ کہتے ہیں کہ جمعہ کے روز دیا ہوا انڈا کھانے سے دردِ شکم رفع ہو جاتا ہے۔ یہ تہوار ظاہر اً قدیم بُت پرستوں سے یادگار ہے جو اسے بہار کی دیوی کے اعزاز میں مناتے تھے۔ الیسٹر کی عید ۲۱۔ مارچ یا اس کے پہلے اتوار کو منائی جاتی ہے۔ اسے عربی میں عید القیامہ کہتے ہیں یعنی مصلوب ہونے کے تیسرے دن بعد مسیح کے دوبارہ زندہ ہو جانے کی خوشی منائی جاتی ہے۔

عید الصلیب اُس صلیب کی یاد میں مناتے ہیں جو قیصر قسطنطین نے آسمان پر دیکھی تھی اور ہاتف سے آواز سُنی تھی کہ صلیب کو اپنے پرچم کا نشان بنا لو فتح تمہاری ہو گی قسطنطین نے ایسا ہی کیا اور دشمن پر فتح پائی۔ اس کے بعد صلیب مسیحیوں کا مذہبی نشان بن گئی کلیسائے روم والے اپنے سینے پر بائیں سے دائیں اور مشرقی کلیسیا والے دائیں سے بائیں صلیب کا نشان بناتے ہیں۔ عیسائیوں کی عید البشارۃ اُس دن سے یادگار ہے جب فرشتے نے ظاہر ہو کر مریم عذرا کو بیٹے کی خوشخبری دی تھی۔

عیسائی دنیا میں کرسمس کا تہوار ۲۵۔ دسمبر کو بڑے جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔ یہ تہوار ایران میں متھرا دیوتا کے یوم میلاد کے طور پر ۲۵۔ دسمبر کو منایا جاتا تھا جس روز سورج کا زوال ختم ہوتا ہے اور وہ دوبارہ شمال کی جانب اپنا سفر شروع کرتا ہے۔ عیسائی اس روز بڑی خوشیاں مناتے ہیں۔ گرجوں کی گھنٹیاں کھنکنے لگتی ہیں۔ چاروں طرف میلے کا سماں ہوتا ہے، لوگ نئے نئے لباس پہن کر جوق در جوق گرجوں کا رُخ کرتے ہیں اور سازوں سے آواز ملا کر جنابِ مسیح کی مناجات میں گیت گاتے ہیں گھر گھر کرسمس کا پیڑ سجایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس روز سینٹا کروز (اصل سینٹ نکولس) ایک سفید بڈھے کی صورت میں گھروں میں جاتا ہے۔ جرمنی کے بعض دیہات میں کرسمس کے بعد چوتھے روز بچے ماں باپ کی پٹائی کرتے ہیں۔ بلغاریہ میں اس روز نوکر اپنے آقا پر حکم چلاتے ہیں۔ اس سے ملتی جلتی ایک رسم ایران میں تھی جسے مرد گیراں کہتے تھے۔ ایک روز کے لئے عورتوں کی حکومت مردوں پر قائم ہو جاتی تھی اور مرد کو عورت کی ہر فرمائش پوری کرنی پڑتی تھی۔

ہندو ہر ماہ کوئی نہ کوئی تہوار مناتے ہیں مثلاً رام نومی (رام کا دن) چیت میں اور پوُرن ماسا ساون کی پندرہ کو مناتے ہیں۔ یہ برہمنوں کا سب سے بڑا تہوار ہے۔ ناگ پنچمی ساون کی پانچویں کو منایا جاتا ہے اور ناگ کی مورتی کی پوجا کی جاتی ہے کیوں کہ اِن دنوں سانپ کے ڈسنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ کاتک میں دیوالی کا تہوار مناتے ہیں جو ویشنو دوں کا سب سے بڑا تہوار ہے۔ مٹھائی سے لکشمی دیوی اور کوبیر دیوتا (دولت کا دیوتا) کی پوجا کرتے ہیں۔ رت جگا جوا کھیل کر گذارتے ہیں۔ سب لوگ گھروں کی منڈیروں پر چراغ روشن کر کے رکھتے ہیں۔ قدیم زمانے کی اکثر قوموں میں جشنِ چراغاں کا رواج تھا۔ اسے فنیقیہ میں مشعلوں کا جشن کہتے تھے۔ مقدس درختوں پر قیمتی چڑھاوے آویزاں کرتے تھے۔ یہ جشن عشتارتی کے مندر میں منایا جاتا تھا۔ ماگھ کی پانچویں کو بسنت یا بہار کی آمد کا تہوار منایا جاتا ہے۔ چاروں طرف گانے بجانے کی آوازیں آتی ہیں، ایک دوسرے پر گلال پھینکتے ہیں۔ پنجاب میں اِس روز رنگ برنگ کی پتنگیں اُڑائی جاتی ہیں۔ بچے جوان بوڑھے پتنگ بازی کے مقابلوں میں جوش و خروش سے حصہ لیتے ہیں۔ عورتیں بسنتی جوڑے یعنی سرسوں کے پھولوں کے رنگ کا زرد لباس پہنتی ہیں۔ تیرہ سے اُنیس پھاگن تک ہولی منائی جاتی ہے۔ یہ شودروں کا سب سے بڑا تہوار ہے اور ظاہراً دراوڑوں سے یادگار ہے۔ لوگ زور شور سے ناچتے گاتے ہیں اور دھما چوکڑی مچاتے ہیں۔ ایک دوسرے پر گلال پھینک کر خوش ہوتے ہیں اور گلال کی پچکاریاں اُٹھائے اُٹھائے پھرتے ہیں۔ ہولیکا ایک راکھشنی تھی جسے شیو دیوتا نے ہلاک کر کے آگ میں پھکوا دیا تھا چنانچہ ہولی پر لوگ آگ کے الاؤ روشن کرتے ہیں اور اُس میں مختلف اشیاء پھینکتے ہیں۔ جلوسوں میں کرشن راَدھا کے نام سے گیت گاتے ہیں جو اکثر فحش ہوتے ہیں۔ ماگھ کی چودھویں رات کو شیو راتری منائی جاتی ہے جس پر شیو لنگ کو گنگا جل سے غسل دیا جاتا ہے اور اُس پر پھول پتے چڑھا کر اُس کی پوجا کی جاتی ہے۔ چوبیس گھنٹے کا برت رکھتے ہیں۔ پُرکھوں (بزرگوں) کی روحوں کو خوش رکھنے کے لئے بھادوں کے دوسرے نصف میں اُن کی دعوت کا سامان کرتے ہیں۔ ان روحوں کو پتری دیو کہا جاتا ہے۔ اِس دعوت پر قسم قسم کے کھانے پکائے جاتے ہیں اور برہمن کھا کھا کر خوب تن تازہ ہوتے ہیں۔ میرٹھ شہر سے ایک میل

باہر نوچندی دیوی کا مندر ہے جہاں نئے چاند کی خوشی میں نوچندی کا میلہ لگتا ہے۔

مسلمانوں کے دو بڑے خوشی کے تہوار ہیں: عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔ عید الفطر کو عید صغیر بھی کہتے ہیں۔ ترکیہ میں اسے رمضان بیرام کا نام دیا گیا ہے۔ یہ عید رمضان کے خاتمے پر منائی جاتی ہے۔ لوگ باگ نئے نئے جوڑے پہنے نمازِ عید پڑھنے کے لئے عیدگاہ کا رُخ کرتے ہیں۔ ہر طرف کھلونوں، مٹھائیوں اور پھلوں کے بازار لگ جاتے ہیں۔ گھروں میں طرح طرح کے پکوان تیار کئے جاتے ہیں۔ مساکین کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ تماشا گاہوں پر نوجوانوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے ہیں۔ رنگ برنگ کے کپڑوں میں ملبوس لڑکوں اور لڑکیوں کے قہقہے گلی کوچوں میں بکھر جاتے ہیں۔ عید الاضحیٰ کو ترک قربان بیرام کہتے ہیں۔ قربانی کے بکروں اور مینڈھوں کی آنکھوں میں سُرمہ لگاتے ہیں اور مہندی لگا کر اُن پر ریشمی چادریں اُڑھائے، سینگوں پر سنہری رنگ مل کر گلی گلی لئے پھرتے ہیں۔ قصابوں کو سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی اور اس روز خوب کمائی کرتے ہیں۔ حاجی منا میں قربانی کرتے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے لاکھوں جانور ذبح کر کے ڈال دیئے جاتے ہیں۔ چودہ شعبان کو شب برات کا تہوار منایا جاتا ہے۔ ہر طرف آتش بازی کے مظاہرے ہوتے ہیں اور پٹاخوں کے دھماکوں سے کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ رات بھر "دھیں پٹاس" ہوتی رہتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس رات کو آنے والے سال کے لئے ہر شخص کا رزق معیّن کیا جاتا ہے۔ تیرہ تیزی کا تہوار آنحضرتؐ کی آخری علالت کی یاد میں مناتے ہیں۔ آپ صفر کے تیرہ دن تپ میں مبتلا رہے تھے اور بارہ ربیع الاول کو وفات پائی تھی۔ انہیں تیرہ تیزی یا تیز بخار کے تیرہ دن کہا جاتا ہے۔ عورتیں گندم اور چنے شکر میں ملا کر اس کا کچھ حصّہ پرندوں کے لئے مکانوں کی چھتوں پر ڈال دیتی ہیں اور بقیہ مساکین میں بانٹ دیتی ہیں۔ آخری چہار شنبہ یا صفر کے آخری بدھ وار کو غریبوں میں کھانا تقسیم کرتے ہیں کیوں کہ اس روز آنحضرتؐ کو قدرے افاقہ محسوس ہوا تھا۔

شیعہ پندرہ شعبان کو امام منتظر قائم قیامت کے جنم دن کا تہوار بڑی خوشی سے مناتے ہیں۔ اُن کا

سب سے بڑا خوشی کا تہوار عید غدیر ہے۔ آخری حج سے واپسی پر ۱۸ ذوالحجہ کو آنحضرتؐ نے لاکھوں کے مجمع میں اونٹوں کے پالانوں کا اونچا مچان بنوایا، امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب کو اس پر کھڑا کر کے آپ کا بازو ہاتھ میں لے کر اوپر اٹھایا اور فرمایا جس کا میں مولا ہوں علیؑ بھی اس کا مولا ہے، میں تمہارے پاس اپنی عترت اور قرآن چھوڑے جا رہا ہوں، یہ دونوں قیامت تک ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔ اس کے ساتھ دین کی تکمیل کا اعلان فرمایا۔ یہ اعلان ایک تالاب (غدیر) کے پاس کیا گیا تھا اس لئے شیعہ عید غدیر کے نام سے یہ جشن جوش و خروش سے مناتے ہیں۔ عشرۂ محرم سوگواری اور ماتم کا تہوار ہے۔ سید الشہدا حسینؑ ابن علیؑ، ان کے رفقاء اور اعزّہ کی شہادت کی یاد میں منایا جاتا ہے جب انہوں نے میدان کربلا میں دشمن کے لشکر سے مقابلہ کرتے ہوئے جانیں قربان کی تھیں۔ امام بارگاہوں میں مجالس عزا برپا ہوتی ہیں جن میں نوحے اور مرثیے پڑھے جاتے ہیں اور سوگواران حسینؑ مصائب کربلا سن کر پھوٹ پھوٹ کر روتے ہیں۔ عشرے کے آخری ایام میں علم، مہندی، جھولے اور ذوالجناح کے جلوس نکلتے ہیں جن میں لوگ اس زور سے ماتم کرتے ہیں کہ در و دیوار کانپنے لگتے ہیں۔ بعض نوجوان جوش میں آ کر زنجیروں اور چھریوں سے اپنے آپ کو لہولہان کر لیتے ہیں۔ یوم عاشور کو ضریح جناب امام اور ذوالجناح کا جلوس نکالتے ہیں۔ عورتیں ننھے شہید علی اصغر کی پیاس کی یاد میں بچوں کو شربت پلاتی ہیں اور کھیر کھلاتی ہیں۔ پنجاب میں اسے ڈولی ڈھوٹھی بانٹنا کہتے ہیں۔ صفر کی بارہ تاریخ کو سر و تن کا تہوار منایا جاتا ہے کیوں کہ اس روز سید الشہدا حسینؑ ابن علیؑ کے کٹے ہوئے سر کو آپ کے تن سے جوڑا گیا تھا۔ عورتیں جناب امام کے نام پر کونڈے یا حلوا پوری دیتی ہیں۔

ربیع الثانی کی گیارہ تاریخ کو شیخ عبدالقادر جیلانی کی فاتحہ کا تہوار گیارھویں شریف منایا جاتا ہے۔ اب ہر ماہ کی گیارھویں تاریخ کو یہ تہوار منانے کا رواج ہو گیا ہے۔

برّصغیر کے کونے کونے میں بزرگوں کے عرس دھوم دھام سے منائے جاتے ہیں۔ عقیدت مند ہجوم کر آتے ہیں، مقبروں پر نئی چادریں چڑھائی جاتی ہیں، قوالیاں ہوتی ہیں، ملنگوں کی ٹولیاں ڈھول کی تھاپ پر

ناچتی ہوئی آتی ہیں، دیگیں کھنکتی ہیں، نیاز بٹتی ہے اور لوگ مزاروں کی جالیاں تھام کر مرادیں مانگتے ہیں۔ سرکس والے آجاتے ہیں، حلوائیوں کی دکانوں پر بڑی رونق ہوتی ہے۔ اُچ شریف میں سید جلال بخاری، سیہون شریف میں شہباز قلندر، ملتان میں بہاء الدین ذکریا، پاک پتن میں فرید الدین گنج شکر، لاہور میں علی ہجویری، دلی میں نظام الدین اولیاء، اجمیر میں معین الدین چشتی وغیرہ کے عرسوں پر عقیدت مند دُور دُور سے آکر شرکت کرتے ہیں۔ عرس کا لغوی معنیٰ بیاہ کا ہے اس لئے انہیں خوشی کے تہوار کہا جا سکتا ہے۔ پیرزادے، سجادہ نشین اور مجاور نذرانے وصول کرتے ہیں۔

موسمی میلے زرعی معاشرے میں ہر کہیں منائے جاتے تھے۔ یہ میلے آج بھی بالعموم فصل بونے یا کاٹنے پر لگتے ہیں اور بار آوری کے مت سے یادگار ہیں جس میں اراضی کی زرخیزی کو بحال رکھنے کے لئے رسمیں وضع کی گئی تھیں۔ مصر قدیم، یونان، بابل، ایران اور ہندوستان میں لوگ نفیریوں کی آواز اور ڈھولوں کی تھاپ پر ناچتے ہوئے ان میلوں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ ہاتھوں میں چھڑے اُٹھائے آتے جن پر لنگ کی شبیہ نصب ہوتی تھی اور اُسے رسیوں سے کھینچ کھینچ کر اُچھالتے تھے۔ ہمارے ہاں بیساکھی کا گالھڑ اسی لنگ سے یادگار ہے۔ جنوبی یورپ کے کارنیوال اُن میلوں سے یادگار ہیں جنہیں یونان میں بیکے نیلیا (دیوتا بیکس کے نام پر جو انگور اور شراب کے نشے کا دیوتا تھا) اور رومی سیٹرنیلیا (سیارہ سیٹرن کے نام پر) کہتے تھے۔ ان میں عورتیں مرد والہانہ انداز میں ناچتے ہوئے جلوس نکالتے تھے جن کے خاتمے پر جنسی بے راہ روی کے مظاہرے برسر عام کئے جاتے تھے۔ بیکس کے تہوار پر نیم عریاں عورتیں بدن پر کھالیں اوڑھے شراب کے نشے میں مست وجود انگور کے رس کے مٹکے کے گرد حلقہ باندھ کر جوش و خروش سے ناچتی ہیں۔ سکندر اعظم کی ماں اولمپیا اس تقریب پر گلے میں سانپ لٹکا کر ناچتی تھی، رومہ کی ملکہ میسالینیا اپنی سہیلیوں کے ساتھ برہنہ ناچتی ہوئی جلوس میں شامل ہوتی تھی۔ رومہ میں یکم مئی کو بہار کی دیوی کا تہوار منایا جاتا تھا جس میں ایک منتخب حسینہ گاڑی میں بیٹھ کر

جلوس کی قیادت کرتی تھی اسے "ملکۂ مئی" کہتے تھے۔ فرانس اور انگلستان میں بہار کی دیوی کا جلوس آج بھی کہیں کہیں دیکھنے میں آتا ہے۔ روما میں مئی کی نویں اور تیرھویں کو انگور کے دیوتا لابیرؔ کا تہوار مناتے تھے جس پر بانجھ عورتیں اُس کے لِنگ کی پُوجا کیا کرتی تھیں۔ فصلیں کاٹنے پر فلوریلیا کا تہوار منایا جاتا تھا اِس پر جنسی بے راہ روی کی کُھلی چھُٹی دے دی جاتی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ اِس طرح برداشت زیادہ ہوگی۔ صنعتی انقلاب کے بعد زرعی دَور کے یہ تہوار خواب و خیال ہوتے جا رہے ہیں۔ سائنس کے انکشافات سے قدیم توہمات و خرافات کو سخت دھچکا لگا ہے اور زرخیزی کے مَت دم توڑ چکے ہیں۔

شاہیت

تاریخِ عالم میں اِستبداد کا آغاز بادشاہوں سے ہوا جو اپنی رعایہ ـــــ لغوی معنی "ریوڑ" ـــــ کے جان و مال اور عزت و ناموس پر پوری طرح متصرف تھے مثلاً شاہِ ایران ریاست میں ہر طرح قدرتِ کاملہ رکھتا تھا سوائے اِس کے کہ وہ اپنا دیا ہوا حکم واپس نہیں لے سکتا تھا۔ بادشاہ بقول سعدی شیرازی کبھی سلام کرنے پر خفا ہو جاتے اور کبھی گالی پر ہنس دیتے تھے۔ روس کے ایک نواب صاحب اپنے علاقے کے دورے پر نکلتے تو جو شخص اُنہیں جھک کر سلام کرتا اُسے کوڑے مرواتے تھے کہ یہ مجھ سے بے تکلف ہونا چاہتا ہے۔ درباریوں کو ہر دم اپنی جان کا کھٹکا لگا رہتا تھا کہ خدا معلوم کب بادشاہ سلامت کسی بات پر خفا ہو جائیں اور زندگی سے ہاتھ دھونا پڑ جائیں۔ ترکی سلطان سلیمان عثمانی کا ایک درباری کہا کرتا تھا کہ میں جب کبھی دربار سے باہر نکلتا تو ٹٹول کر تسلی کر لیتا کہ میرا سر ابھی گردن پر ہے۔ اپنے اقتدار کو بحال رکھنے کے لئے کئی بادشاہوں نے جنہیں مؤرخین اعظم کہتے ہیں محض شبہات کی بنا پر اپنے بھائیوں، بیٹوں، بھانجے، بھتیجوں کو بے دریغ قتل کروا دیا۔ ان لوگوں کی نظروں میں اِنسانی جان پرِکاہ سے بھی ارزاں تر تھی۔ روس کے ایوان خوفناک، چنگیز خان، نادر شاہ، تیمور لنگ، اٹیلا، محمد تغلق وغیرہ نے بے گناہوں کے خون کی ندیاں بہا دیں۔ بادشاہوں کی اکثریت کم سواد، بے شعور اور برخود غلط احمقوں پر مشتمل تھی۔ وہ اپنے آپ کو زمین پر خدا کا نائب سمجھتے تھے۔ چنگیز خاں کہا کرتا تھا "اوپر خدا نیچے خان" اُن کی نافرمانی گویا خدا کی نافرمانی تھی۔ شاہانِ ایران اپنے نام کے ساتھ "برادرِ مہر و ماہ" لکھا کرتے تھے۔ مصر کے فرعون، چین کے فغفور، اشوریا کے سلاطین، جاپان کے میکاڈو

اپنے آپ کو دیوتا سمجھتے تھے۔ قیصرِ روم کالی گولا سونے کے تاروں کی مونچھیں لگاتا تھا کہ لوگ مجھے دیوتا سمجھیں۔ اِن لوگوں نے شاہی دبدبے اور فرِ شہنشاہی کو قائم رکھنے کے لئے ایسی رسمیں وضع کر رکھی تھیں کہ عوام پوجا کی حد تک ان کی تکریم کرنے پر مجبور تھے۔ جلال الدین اکبر صبح سویرے درشن کے جھروکے میں کھڑا ہوتا تھا اور ہزاروں آدمی اُسے دیکھتے ہی سجدے میں گر پڑتے تھے۔

اپنے آپ کو عوام سے ممتاز رکھنے کے لئے بادشاہ اپنے سروں پر سونے کے گراں بہا تاج پہنتے تھے جن پر ہیرے جواہرات جڑے ہوتے۔ شاہانِ ایران کے تاج اتنے بھاری بھرکم ہوتے کہ سر پر رکھ نہیں سکتے تھے۔ تاج کو سونے کی زنجیروں سے ایوان کی چھت سے لٹکا دیا جاتا تھا اور بادشاہ اُس میں سر دے کر بیٹھ جاتا تھا۔ تاج میں پرِ ہما کی فرضی کلغی لگانے کا رواج بھی تھا۔ اشوری سلاطین کے تاج غیر معمولی طور پہ اونچے ہوتے تھے۔ کالدی بادشاہ سر پر ہلال کا نشان پہنتے تھے جس کے سرے اُوپر کو اُٹھے ہوتے۔ سکندرِ اعظم اپنے تاج پہ مصر کے دیوتا آمن رع کے مقدس بیل کے سینگوں کا نشان پہنا کرتا تھا۔ مغربی سلاطین اپنے سروں پر کنگروں والا تاج رکھتے تھے۔ ملکہ کا تاج بھی اسی وضع کا تھا لیکن قدرے ہلکا ہوتا تھا۔ تاج میں بیش قیمت ہیرے جڑوانے کا رواج تھا۔ اِس ضمن میں کوہِ نور ہیرا دلچسپ مثال پیش کرتا ہے جو نادر شاہ ایران لے گیا، وہاں سے درانیوں کے ہاتھ لگا۔ شاہ شجاع سے رنجیت سنگھ نے ہتھیا لیا اور آخر شاہ برطانیہ کے تاج میں جڑا گیا۔ ہندوستان میں مغل بادشاہوں نے راجپوتوں کی کھڑکی دار پگڑی پر سرپیچ اور جیغہ کا اضافہ کر کے اُسے اپنا تاج بنا لیا۔

بادشاہوں کا لباس بھی قیمتی حریر و دیبا کا ہوتا تھا جس کا رنگ قرمزی یا ارغوانی کرایا جاتا تھا۔ گریباں میں لعلِ بے بہا کے تکمے لگائے جاتے تھے۔ جوتے ہیرے جواہر سے مرصّع ہوتے تھے۔ جڑاؤ کمربند کی ایجاد ملکہ زبیدہ سے منسوب کی جاتی ہے۔ تلوار کے پرتلے، دستے اور خنجر کے دستوں میں بھی ہیرے

جڑے جاتے تھے ۔ بادشاہ جسے اپنا لباس یا خلعت عطا کرتا وہ عمر بھر کے لئے آسودہ حال ہو جاتا تھا ۔ایرانی اور مغل بادشاہوں کے لئے شاہی کارخانوں میں پارچے بُنے جاتے تھے اور وہ مخمل، فرنگی، کاشی، مشجر، خارا، اطلس خطائی، تافتہ، ابری وغیرہ کے قیمتی لباس زیب تن کرتے تھے ۔شاہی کارخانوں کے ملبوسات شہزادوں اور شہزادیوں کے سوا کوئی نہیں پہن سکتا تھا ۔جاپان کا میکاڈو آج بھی جو لباس ایک بار پہنتا ہے، دوسری بار نہیں پہنتا۔

اشوری بادشاہوں کا تخت ٹھوس سونے کا ہوتا تھا جس پر چتر یا سایہ لگا ہوتا تھا ۔غلام پیچھے کھڑا مگس رانی کرتا رہتا ۔مغل بادشاہ تخت نشینی کے وقت ایک ایسی چوکی پر بیٹھتے تھے جو خون آلود ہوتی جیسا کہ جہانگیر کے سوانح سے معلوم ہوتا ہے ۔تخت میں بیش بہا ہیرے، لعل، زمرد، نیلم، پکھراج، یاقوت جڑے جاتے تھے ۔اس ذیل میں خسرو پرویز کا تخت تاکدیس اور شاہجہان کا تخت طاؤس خاص طور سے قابل ذکر ہیں ۔بادشاہ تخت پر گاؤ تکیے سے لگ کر چہار زانو بیٹھتا تھا ۔تخت و تاج کے علاوہ آفتاب گیر، دُور باش (شاہی عصا) سائبان، شامیانہ، نوبت، عَلَم، سکّہ اور نقارہ بادشاہت کے خاص نشان تھے۔

ایرانی بادشاہ سفر کے وقت تختِ رواں پر بیٹھتے تھے جسے خچر کھینچتے تھے ۔ایرانی اور مغل سلاطین کے جلو میں ماہی مراتب لے کر چلتے تھے ۔اس کا آغاز خسرو پرویز سے ہوا تھا ۔جب خسرو پرویز بہرام چوبیں کو شکست دے کر دوبارہ تخت نشیں ہوا تو آفتاب برجِ ماہی میں تھا چنانچہ اس نے حکم دیا کہ فولاد کے دو گولے بنوا کر انہیں چھڑوں پر نصب کیا جائے ۔انہیں کوکب کا نام دیا گیا ۔تیسرے چھڑے پر سونے کی مچھلی بنوا کر لگائی گئی ۔ان تین چھڑوں کو ماہی مراتب کہتے تھے۔

بادشاہ شکار یا فوج کشی کے لئے نکلتا تو اگلے پڑاؤ پر پیش خیمہ لگا دیا جاتا تھا ۔جہانگیر کے زمانے میں پیش خیمہ کی بار برداری کے لئے ساٹھ ہاتھی، دو سو اونٹ، ایک سو خچر اور ایک سو قلی درکار تھے۔

بادشاہ کے خیمے کے گرد گلاں بار یا قنات تان دی جاتی تھی اور پھر اُمراء کے خیمے نصب کیے جاتے تھے۔ لشکر گاہ کے گرد سراپردہ لگوانے کا آغاز بیرم خان سے ہوا۔ راتوں کو ایک بلند مقام پر آکاس دیا روشن کرتے تھے جس کی روشنی ساری لشکر گاہ پر پڑتی تھی۔ دو درے خیمہ کو خرگہ کہتے تھے۔ بارگاہ چوّن خیموں پر مشتمل ہوتی تھی۔ اس کے سائے تلے ایک وقت میں دس ہزار آدمی آ جاتے تھے۔ ایک ہزار آدمی اسے سات دنوں میں کھڑا کرتے تھے۔ محلوں میں قندیل، شمعدان، جھاڑ فانوس، دو شاخہ، سہ شاخہ، پنج شاخہ اور قمقمے روشن کیے جاتے تھے۔ فرش پر قالین، غالیچے، جاجم، شطرنجی، نمدے اور گدّے بچھانے کا رواج تھا جس کی ٹٹی جلال الدین اکبر نے ایجاد کی تھی۔ بیگمات چوڈولی میں سفر کرتی تھیں جسے دو کہار اُٹھا کر چلتے تھے۔ ہاتھی پر بیٹھنے کی بیگمات کی نشست کو میگڈمبر کہا جاتا تھا۔ زنجیرِ عدل سب سے پہلے شاہ چین یوتو نے لٹکوائی تھی، بعد میں راجہ اننگ پال والیٔ دلّی اور جہانگیر نے اپنے اپنے محلوں میں اسے آویزاں کرایا تھا۔

سفر ہو یا حضر دربار پابندی سے لگتا تھا۔ درباری خاص لباس پہن کر آتے تھے اور تخت کے سامنے دو رویہ دست بستہ کھڑے ہو جاتے تھے۔ بادشاہ دربار میں آتا تو نقیب بلند آواز میں اُس کی آمد کا اعلان کرتا تھا اور نہایت مبالغہ آمیز مدحیہ الفاظ میں بادشاہ کا نام لیتا تھا۔ دربار کو برخواست کرنے کے لئے خاص اشارے مقرر تھے مثلاً بادشاہ قبضۂ شمشیر پر ہاتھ رکھتا یا شاہی عصا رکھ دیتا تو درباری سمجھ جاتے اور جھکے جھکے ہاتھ سینے پر رکھے پیچھے ہٹتے ہوئے باہر نکل جاتے تھے۔ دربار کے آداب کے مطابق جب تک بادشاہ کسی کو مخاطب نہ کرتا بات کرنا ممنوع تھا۔ شہزادوں کے سوا کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ بادشاہ جب کوئی بات کرتا خواہ وہ کیسی ہی معمولی ہوتی خوشامدی درباری "کرامت کرامت" پکار اُٹھتے تھے۔ مشرقی سلاطین کے درباروں میں ایک منجّم، ایک مسخرہ، ایک جلّاد، ایک نظر بٹّو (مسکوٹ) ایک طبیب اور ایک شاعر ہر وقت موجود رہتے تھے۔ منجّم شکار یا فوج کشی کے لئے ساعت سعید بتلاتا تھا۔ نظر بٹّو عام طور

سے کوئی گیڑا ہوتا تھا جو بادشاہ سلامت کو نظرِ بد سے محفوظ رکھتا تھا۔ طبیب دوا اور غذا تجویز کرتا تھا۔ شاعر بادشاہ سلامت کی مدح میں نہایت مبالغہ آمیز قصیدے پڑھا کرتا تھا۔ حاجب یا باربک لوگوں کو بادشاہ کے حضور پیش کرنے پر مامور تھا۔ مسخرہ تفریحِ طبع کا سامان فراہم کرتا تھا اور جلاد بر سرِ دربار مجرموں کی گردن مارتا تھا۔ بغاوت کا مجرم دربار میں پابجولاں لایا جاتا تو خلیفہ کہا کرتا ، یاغلام سیف و نطع " یعنی تلوار اور چمڑے کا فرش لاؤ۔ مجرم کو اس فرش پر سرنگوں بٹھا کر جلاد اُس کی گردن مار دیتا تھا اور غلام اِس فرش کو نعش سمیت لپیٹ کر باہر لے جاتے تھے ۔

تخلیہ کی مجلس کو مُنادمہ کہتے تھے جس میں صرف منتخب مصاحب یا نُدماہی شریک ہو سکتے تھے۔ اِن مجالس میں جامِ شراب کے دَور چلتے تھے۔ خوش گلو کنیزیں گاتی بجاتی تھیں۔ دربار کے رسمی آداب کے بجائے اِس مجالس میں بے تکلفی کا سماں ہوتا تھا۔ نُدما ایک دوسرے پر پھبتیاں کستے اور بذلہ سنجی سے بادشاہ کا جی بہلاتے تھے۔ بادشاہ باذوق ہوتا تو شعر و ادب کا بھی چرچا ہوتا تھا ۔

بادشاہ کسی امیر کو جاگیر عطا کرتا تو فرمان پر اپنے ہاتھ کا پنجہ لہو میں تر کر کے ثبت کرتا تھا۔ بعد میں سُرخ روشنائی یا صندل کے محلول سے یہ کام لینے لگے۔ جب یہ فرمان امیر کے پاس پہنچتا تو وہ احترام سے آگے بڑھ کر اسے وصول کرتا اور سر آنکھوں سے لگا کر اسے کھولتا تھا۔ بادشاہوں کے درباروں میں رشوت کا بازار گرم تھا۔ درباری ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کے لئے سازشوں کا جال بچھاتے رہتے تھے۔ رشوت کھُلے بندوں لی جاتی تھی۔ اِس کا نام دستوری رکھ لیا تھا جیسے آج کل ہمارے ہاں اسے کمیشن کہتے ہیں ۔

ایران میں بادشاہ کے حرم کو مشکوئے مُعلّیٰ کہتے تھے۔ ہندوستان میں اسے شبستانِ اقبال کا نام دیا گیا۔ حرم سرا میں سیکڑوں لونڈیاں اور بیگمات رہتی تھیں۔ اکثر لونڈیاں ایسی تھیں کہ انہیں شاذو نادر ہی شاہی تخلیے میں بلایا جاتا تھا اور وہ عمر بھر محرومی کی آگ میں پڑی جلتی تھیں۔ ایسے میں کسی لونڈی سے

کوئی لغزش ہو جاتی تو خواجہ سرا چپکے سے اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیتے تھے۔ حرم سرا میں مسلح عورتوں کا پہرہ ہوتا تھا جو اکثر تُرکی نسل سے ہوتی تھیں۔ انہیں اردا بیگی کہتے تھے۔

بادشاہ لشکر کشی کے لئے نکلتے تو فوجی دستوں کے اپنے اپنے رنگ برنگ کے پرچم لہراتے تھے۔ شاہی پرچم کو علم یا لوا کہا جاتا تھا۔ ایرانیوں کا جھنڈا درفش کاویانی تھا جس پر کاوا لوہار کی چمڑے کی دھونکنی آویزاں تھی۔ اس کے ساتھ پھریرے لہراتے تھے۔ اس پر سُو کا مینار سے ساخت سعید میں سونے کے تاروں سے کاڑھ دیا گیا تھا۔ یہ جھنڈا جنگ قادسیہ میں سرنگوں ہوا۔ مغولوں کا جھنڈا تُغ کہلاتا تھا جس پر قطاس یا پہاڑی گائے کی دُم کے گچھے آویزاں تھے۔ عثمانی ترکوں کے جھنڈے پر گھوڑوں کی سات دُمیں لٹکا دی گئی تھیں۔ ایران کے قاچار بادشاہوں کے پرچم پر شیر اور تلوار کا نقش کاڑھا گیا تھا۔ محمود غزنوی کے پھریرے پر شیر اور نیزوں کی شبیہ دکھائی دیتی تھی۔ سُمیریا کے جھنڈے کا دو سروں والا عقاب جرمنی اور البانیہ سے ہوتا ہوا اضلاع متحدہ امریکہ تک جا پہنچا۔ امریکہ کے پرچم پر ستارے اور دھاریاں، فرانس کی گل زنبق، ہندوؤں کے پرچم کا دھرم چکر (آٹھ پہلوؤں کا چکر) جو بودھوں کا نشان تھا۔ بودھ اسے گھمانا جزو عبادت سمجھتے تھے) ترکوں اور پاکستانیوں کے پھریروں کا ہلال وغیرہ کے نشان ٹوٹم مت سے یادگار ہیں جب قبائل اپنے اپنے ٹوٹم سے پہچانے جاتے تھے۔

بادشاہوں نے اپنا خزانہ معمور کرنے کے لئے رعایا پر کئی محصول لگا رکھے تھے۔ سب سے بڑا محصول خراج یا مالیہ تھا جو دہقانوں سے وصول کیا جاتا تھا۔ روما میں ہر شخص کی ذاتی املاک پر سالانہ محصول لیا جاتا تھا۔ مغولوں نے تمغہ کے نام سے تاجروں اور کسبیوں پر محصول لگا رکھا تھا۔ کنعان میں صدقہ اور عشر کے محصول پروہتوں کی مدد معاش کے لئے وقف تھے۔ یہودی عشر کو دہ یکی کہتے تھے۔ مذہبی پیشواؤں کے لئے خمس لینے کا رواج بھی تھا۔ مرہٹے اپنے زیر اثر علاقوں سے چوتھ یا سالانہ آمدنی کا ایک

چوتھائی حصہ وصول کرتے تھے۔ سکھ پیداوار کا پانچواں حصہ راکھی (حفاظت) کے نام سے لیتے تھے۔ اسلامی ریاستوں سے غیر مسلموں سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا۔ مغلوں کے دورِ زوال میں کسانوں سے ہر ہل پر چوبچہّ وصول کرنے لگے جو دس سے پچاس روپے سالانہ ہوتا تھا۔ ہر بالغ سے تین روپے سالانہ لئے جاتے تھے۔ اسے پگڑی محصول کہتے تھے۔ ہر گھر سے کھدّتی یا چولھا ٹیکس کے نام پر دو سے چار روپے سالانہ وصول کئے جاتے تھے۔ بعض اوقات محصول لگانے کے لئے عجیب و غریب حیلے بہانے تلاش کئے جاتے تھے۔ محمد پاشا کو ترکیہ کی حکومت نے موصل کا گورنر مقرر کیا۔ اُس نے وہاں کے شہریوں پر دانتوں کا محصول لگا دیا کیوں کہ اُس کے بقول موصل کی خراب غذا نے اُس کے دانت بگاڑ دیئے تھے۔ ایک یونانی حاکم نے اپنی رعایا پر اپنی بیگم کے لئے صابن ٹیکس لگا دیا جس پر ایک بگڑے دل نے کہا کتنی زیادہ ہو گی وہ غلاظت جسے دور کرنے کے لئے اتنے صابن کی ضرورت ہے۔

جُرم و سزا

آج سے کم و بیش دس ہزار برس قبل زرعی انقلاب برپا ہوا جس کے نتیجے میں معاشرۂ انسانی صورت پذیر ہوا۔ کچھ لوگ بدستور پہاڑوں، جنگلوں اور ریگستانوں میں خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ وہ جفاکش اور خطر پسند تھے۔ جب کبھی انہیں موقع ملتا وہ بستیوں پر ٹوٹ پڑتے اور لوٹ مچا دیتے۔ ان کی ترکتاز کا مقابلہ کرنے کے لئے بستیوں کے کچھ دلیر اور تنومند لوگوں نے جتھے بنا لئے اور تحفظ دینے کے نام پر لوگوں سے جنس اور نقدی وصول کرنے لگے۔ مرورِ زمانہ سے ان سرداروں نے باقاعدہ حکومتیں قائم کر لیں اور بادشاہ بن بیٹھے۔ بادشاہوں نے قدرتاً ایسے قوانین اور قواعد وضع کئے جو اُن کے اور اُن کے ہم نشینوں کے اقتدار کو محکم کر سکتے تھے۔ شاہ حمورابی دائمی بابل کے ضابطۂ قوانین کے مطالعے سے اس حقیقت کا شعور ہوتا ہے کہ یہ قوانین برسرِ اقتدار طبقے کی ذاتی املاک کے تحفظ کے لئے نافذ کئے گئے تھے۔ جن کاموں سے ذاتی املاک پر زد پڑتی تھی انہیں سنگین جرائم قرار دے کر اُن کی سزا موت تجویز کی گئی۔ ان جرائم میں بغاوت، غداری، ڈاکا، چوری اور زنا شامل تھے۔ عورت بھی بھیڑ بکریوں کی طرح ذاتی املاک میں شمار ہوتی تھی اس لئے کسی کی عورت کو ورغلانا یا اغوا کرنا بھی سنگین جرم قرار پایا۔ شوہر اس بات کا مجاز تھا کہ وہ اپنی زوجہ کو کسی غیر مرد کے ساتھ ناگفتہ بہ حالت میں پکڑ لے تو دونوں کو جان سے مار ڈالے۔ "آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت" کا جو اصول شریعت موسوی کی اساس بن گیا حمورابی کے ضابطے ہی سے ماخوذ تھا۔

تخت نشینی کے وقت۔ بیٹوں اور بھائیوں میں جھگڑے اُٹھ کھڑے ہوتے تھے اِس لیے جس
کسی کو تخت و تاج ملتا وہ اپنے بھائیوں کو قتل کرا دیتا تھا اور قریبی عزیزوں کو بندی خانے میں ڈال دیتا
تھا عثمانی سلطان محمد خاں فاتح نے یہ قانون جاری کیا کہ تخت پر بیٹھتے ہی بادشاہ اپنے بھائیوں کو قتل کرا دے
تاکہ بغاوت کا اندیشہ نہ رہے۔ ہندوستان میں اورنگ زیب نے یہی کچھ کیا تھا جہانگیر کی موت پر آصف
خاں نے شاہجہاں کے لئے تخت نشینی کی راہ ہموار کرنے کے لئے تمام شہزادوں کو تہ تیغ کرا دیا۔ قدیم
ہندوستان میں یہی رواج تھا۔ اشوک نے تخت پر بیٹھتے ہی اپنے بھائیوں اور عزیزوں کو ہلاک کر دیا تھا۔
بادشاہ کے خلاف بغاوت ایک ناقابلِ معافی جرم تھا۔ بلبن کے خلاف طغرل حاکم بنگال نے خروج کیا لیکن
شکست کھائی۔ بلبن نے حکم دیا کہ دو رویہ سولیاں نصب کی جائیں اور ان پر طغرل اور اُس کے عزیزوں اور
ہواخواہوں کو گاڑ دیا گیا۔ جہانگیر کے باغی بیٹے خسرو نے بغاوت کی۔ اُسے شکست ہوئی۔ دریائے راوی کے
کنارے دُور دُور تک سولیاں کھڑی کی گئیں جن پر شہزادے کے حامیوں کو لٹکا دیا گیا؛ پھر خسرو کو ہاتھی پر بٹھا
کر اُن کے سامنے سے گذارا گیا۔ خسرو کے بڑے ساتھی عبدالعزیز خاں اور حسین بیگ تھے۔ عبدالعزیز خاں
کو گائے کی کھال میں اور حسین بیگ کو گدھے کی کھال میں سلوا دیا قسطنطین نے اپنے بیٹے اور بھانجے کو شبہ
کی بنا پر موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ نادر شاہ افشار نے اپنے قابل بیٹے کو اندھا کرا دیا۔ شاہ عباس صفوی نے
ایک امیر کو حکم دیا کہ اُس کے بڑے بیٹے کا سر کاٹ کر لائے۔ امیر نے تعمیل کی اور پھر اُسے حکم ملا کہ اپنے بیٹے کا
سر بھی کاٹ کر حاضر کرے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ایران میں باغی کو شق کی خوفناک سزا دی جاتی تھی جسے سناتے
وقت بادشاہ سُرخ رنگ کا چغہ پہن لیتا تھا۔ مجرم کو ٹکٹکی پر اُلٹا لٹکا کر جلاد لبغدے سے اُس کی دُبر کے
درمیان سے ریڑھ کی ہڈی کو گردن تک کاٹ دیتا تھا اور پھر لوتھ کو سولی پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ ترکیہ میں مجرم
کو موت کی سزا سُنانے کے بعد منصف اپنا قلم توڑ دیتا تھا۔

شاہان اشوریا نے باغیوں کے لیئے خوفناک سزائیں مقرر کر رکھی تھیں مثلاً اندھا کرانا، زندہ کھال کھچوا دینا، دیواروں میں زندہ چنوا دینا، پنجرے میں بند کر کے ساتھ ساتھ لیئے پھرنا، پزاوے میں جلا دینا، شکنجے میں بیل کر ہڈیاں چور چور کر دینا، جوڑ جوڑ کاٹ کر لوتھ کو سولی پر ٹانگ دینا، تختہ میں بند کر کے آرے سے چیر دینا وغیرہ۔ تاریخ عالم میں دشمن کو اندھا کرنے کی سزا سب سے پہلے بخوکد نضر شاہ بابل نے یہودیہ کے بادشاہ صدقیاہ کو دی تھی۔ پہلے صدقیاہ کے بیٹے کو اُس کے سامنے قتل کرایا اور پھر اُسے اندھا کر دیا گیا تاکہ جب تک جیتا رہے یہ منظر بھول نہ سکے۔ مغلیہ خاندان میں ہمایوں نے اپنے بھائی کامران کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا دیں۔ فرخ سیر، جہاندار شاہ اور شاہ عالم کو اندھا کر دیا گیا۔ مادھوجی سندھیا نے باغی سردار غلام قادر روھیلہ کا منہ کالا کر کے اُسے اُلٹے رُخ گدھے پر بٹھا کر اُس کی تشہیر کی، پھر اُس کے ناک، کان کٹوا دیئے اور ہاتھ پاؤں قطع کرا کر لوتھ شاہ عالم کے پاس بھجوا دی۔

کلہ منارے بنوانے کی رسم اشوریوں اور منگولوں سے لی گئی تھی۔ اشوربنی پال فخریہ کہتا ہے کہ اُس نے ہزاروں دشمنوں کو قتل کر کے اُن کے سروں کے کلہ منارے بنوائے۔ چنگیز خاں، ہلاکو، تولی، باتو، قبلائی اور چغتائی جدھر گئے اپنے پیچھے کلہ منارے چھوڑتے گئے۔ ظہیر الدین بابر اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ اُس نے بھی مقتول افغانوں کے سر کاٹ کر کلہ منارہ تعمیر کرایا تھا۔ دشمنوں کا قتل عام کرا کر اُن کی لاشوں کو زیرِ تعمیر عمارتوں کی بنیادوں میں دفن کرنے کا رواج تھا۔ بیرم خاں نے جالندھر کے نواح میں پٹھانوں کو شکست دے کر اُن کی کھوپڑیوں سے منارہ تعمیر کرایا تھا۔ ڈاکوؤں کو عبرت ناک سزائیں دی جاتی تھیں۔ اُن کی لاشیں سولیوں پر لٹکا دی جاتی تھیں جہاں چیلیں اور کوّے انہیں نوچ نوچ کر کھا جاتے تھے۔ علاء الدین خلجی نے ہزاروں مغل قیدی دلی کے نئے قلعے کی بنیادوں میں زندہ دفن کرا دیئے تھے۔

زنا کی سزا موت تھی۔ زنا بالجبر کا ارتکاب کرنے والے کو عذاب دے کر مارتے تھے۔ لوطی شاتر

میں قانون کی ایک شق یہ ہے کہ بیاہتا عورت کے ساتھ کوئی آدمی زنا کرے تو اُسے لوہے کے تپائے ہوئے پلنگ پر کس دیا جائے اور عورت کو برسرِ عام کُتوں سے پھڑوا دیا جائے۔ کنواری لڑکی جس کی نسبت کہیں نہ ٹھہری ہو اگر اپنی مرضی سے کسی شخص کے ساتھ خلوت میں جاتی تو سزا کے طور پر دونوں کا بیاہ کر دیا جاتا تھا گویا عمر قید کی سزا دی جاتی تھی۔ کنواری لڑکی کے ساتھ نرمی اس لئے برتی جاتی تھی کہ وہ کسی کی منکوحہ یا منسوبہ نہ ہونے کے باعث اُن کی ذاتی املاک میں شامل نہ تھی۔ منو کا قانون یہ ہے کہ اگر کوئی برہمن لڑکا اپنے گرو کی پتنی سے بدکاری کرے تو اُس کا بدن یونی کے نقش سے داغ دیا جائے، کوئی کھشتری کسی برہمنی سے مُنہ کالا کرے تو اُس کا سر گدھے کے بول سے مونڈوایا جائے۔ اضلاع متحدہ امریکہ میں جس حبشی پر کسی سفید فام عورت کے ساتھ زنا بالجبر کا الزام ہوتا اُسے درخت سے باندھ کر اور اس پر مٹی کا تیل گرا کر آگ لگا دیتے تھے، عدالت میں لے جانے کی زحمت گوارا نہیں کرتے تھے۔ کنعانی زانیہ کے سر کے بال مونڈوا دیتے تھے۔ بابل میں جس عورت پر زانیہ ہونے کا شک ہوتا اُسے دریا میں پھکوا دیتے، بچ نکلتی تو اُسے بے گناہ مان لیا جاتا تھا ڈوب مرتی تو کیفرِ کردار کو پہنچ جاتی۔ ایران اور ہندوستان میں زنا کے الزام پر مرد اور عورت جلتی آگ کے شعلوں میں گذارتے تھے، بچ نکلتے تو معصوم سمجھے جاتے تھے۔ کیکاؤس شاہِ ایران کی ملکہ سودابہ نے اپنے نوجوان سوتیلے بیٹے سیاوش کو ورغلانے کی کوشش کی۔ وہ نہ مانا تو اُس پر بادشاہ کے سامنے دراز دستی کا الزام لگایا۔ سیاوش کو آگ میں گذارا گیا اور وہ بچ نکلا۔ لنکا کی فتح کے بعد رام نے سیتا کی عصمت پر شک کیا اور راون کے ساتھ بدکاری کے شبے میں اُسے بھڑکتی ہوئی آگ میں گذارا لیکن اُس کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔

یورپ کے وسطی زمانوں میں اگر کوئی جاگیردار اپنے کسی کھیت غلام کی کنواری بیٹی سے زنا بالجبر کرتا تو عدالت اُسے تین شلنگ جرمانہ کر کے بری کر دیتی تھی۔ ایران میں زانیہ کی ناک کاٹ دیتے اور زانی کو ملک بدر کر دیتے تھے۔ مجوسیت میں لوطی کی سزا موت رکھی گئی تھی۔ ہمارے ہاں آج بھی بعض مرد اپنی بدکار

زوجہ کی ناک اور چوٹی کاٹ دیتے ہیں۔ بازنطین کے قیصر جسٹینین کا قانون تھا کہ زنا بالجبر کرنے والے کو موت کی سزا دی جاتی تھی اور اُس کی جائداد ضبط کر کے مظلوم عورت کو دے دی جاتی تھی۔ جس حاکم کے علاقے میں ڈکیتی کی واردات ہوتی اُس سے کوئی ہوئی رقم کے برابر معاوضہ اُس شخص کو دلوایا جاتا تھا جو لُٹ جاتا تھا۔ روما میں چوری کی سزا یہ تھی کہ چور موقع پر پکڑا جاتا تو اُسے صاحبِ خانہ کی غلامی میں دے دیا جاتا تھا۔ منوسمرتی میں چور کا ہاتھ کاٹ دینے کا حکم ہے۔ مجوسیت میں بھی چور کی یہی سزا تجویز کی گئی ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے مُلّا محسن فانی اپنی کتاب دبستان مذاہب میں لکھتا ہے۔

"اگر کوئی شخص ایک یا دو دام چرائے تو اُس کے دو کان کاٹ دیئے جائیں اور دس ضرب بید مارے جائیں اس کے بعد ایک ساعت جیل میں رکھ کر چھوڑ دیا جائے۔ تین دام چرائے تو داھنا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ پانچ دام چرائے تو پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔"

اُنیسویں صدی کے اواخر تک انگلستان میں گوبھی کا پھول یا بھیڑ چرانے کی سزا موت تھی۔ بچوں کو بھی معاف نہیں کیا جاتا تھا۔

بعض اوقات مذہبی عقائد کا اختلاف بھی سنگین جُرم سمجھا جاتا ہے۔ اسی بنا پر مسلمانوں اور عیسائیوں میں طویل صلیبی جنگیں لڑی گئیں اور لاکھوں افراد موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ یورپ میں رومن کیتھولک اور اصلاح یافتہ کلیسا والے پوری ایک صدی برسرِپیکار رہے اور ایک دوسرے کے گلے کاٹتے رہے۔ آٹھویں نویں صدیوں میں برہمنوں نے بودھوں کا استحصال اس بے رحمی سے کرایا کہ بدھ مت جو ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل چکا تھا حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا گیا۔ بودھوں کے ستوپے اور دیہارے آگ لگا کر خاکستر کر دیئے گئے اور بودھوں کو اُبلتے ہوئے تیل میں پھکوا دیا گیا۔ مذہبی اختلاف کی بنا پر ایک ہی مذہب کے مختلف فرقوں نے ایک دوسرے کو گردن زدنی قرار دیا۔ ابتدائی دور کے وہابیوں نے

دوسرے مسلمانوں پر کُفر کا فتویٰ لگایا اور اُن کے قتل کو جائز قرار دیا، حاجیوں کے قافلے لوٹے، انہیں تہ تیغ کیا اور مکّہ مدینہ کے شہروں کو تاراج کیا۔ ایران کے شیعوں اور ترکی کے سُنیوں میں کئی خون آشام جنگیں لڑی گئیں۔ اورنگ زیب نے دکن کی شیعہ مملکتوں پر کئی سال حملے جاری رکھے اور انہیں برباد کر کے دم لیا۔ شیعہ عالم نصیر الطوسی نے ہلاکو سے ساز باز کر کے بغداد کی تباہی کا سامان کیا۔ فرانس میں ہیوگو نو فرقے کے ہزاروں افراد کو ایک ہی رات تلوار کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ کواذ شاہ ایران نے مزدک اور اُس کے ہزاروں پیروؤں کا قتل عام کرایا۔ بنو عباس کے دورِ حکومت میں مانویہ پر زندقہ کا الزام لگا کر انہیں چُن چُن کر قتل کیا گیا۔ نیرو قیصرِ روم نے ایک رات تین ہزار عیسائیوں پر لعنت چھڑکوا کر آگ میں بھسم کرا دیا۔ سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑا کیوں کہ وہ مقامی دیوتاؤں کی پوجا سے منع کرتا تھا۔ برونو، دنی نی، منصور حلاج، شیخ علائی، شیخ سہروردی مقتول کو قتل کیا گیا۔ مذہبی اختلاف کی بنا پر قتل کرنا زیادہ عبرت ناک ہے کہ اس جُرم پر قاتل کی ضمیر اُسے پریشان نہیں کرتی۔

غلاموں کے بارے میں رومہ کا ایک قانون خاص طور سے سنگدلانہ تھا۔ جب کوئی غلام اپنے آقا کے ظُلم سے تنگ آ کر اُسے قتل کر دیتا تو اُس کے ساتھ گھر کے سارے غلاموں کو موت کی سزا دی جاتی تھی۔ رومہ کے ایک زر پرست کراسس کو بڑی عبرت ناک سزا دی گئی تھی۔ کراسس اپنے زمانے کا امیر ترین آدمی تھا۔ ایک دفعہ اُسے رومی فوج کا سپہ سالار بنا کر پارتھیوں کے خلاف لڑنے کے لئے بھیجا گیا۔ رومیوں نے شکست کھائی اور کراسس کو گرفتار کر کے پارتھی سردار کے سامنے لایا گیا۔ سالار نے کہا یہ شخص سونے چاندی کا پجاری ہے۔ اس کے حلق میں پگھلا ہوا سونا انڈیلا جائے۔ حُکم کی تعمیل ہوئی اور کراسس تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

ہندوستان میں کوئی شخص بھُولے سے گائے کو مار دے تو پرائشچت (کفارہ) کے لئے پیدل

چل کر پڑ گیا۔۔ جاتا ہے، راستہ میں بھیک مانگتا جاتا ہے اور پکارتا جاتا ہے "میں ہتیارا، میں ہتیارا"

دنیا بھر کے دیہاتی علاقوں میں پنچایت کا نظام کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا ہے۔

پنچایت (پانچ آدمیوں پر مشتمل جماعت) کے بڑے پنچ کو پنجاب میں کھڑپنچ کہتے ہیں۔ پنجاب میں پنچایت کے لئے پرھیا کا لفظ ہے جو کسی گاؤں کے عمر رسیدہ اور انصاف پسند آدمیوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کا فیصلہ فریقین کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ دیہاتی اپنے چھوٹے موٹے جھگڑے پرھیا ہی میں لے جاتے ہیں۔ آج بھی چھوٹا ناگ پور میں پرھیا کا نظام موجود ہے جو ظاہراً پنجاب اور سندھ ہی سے جنوبی ہند تک پہنچا تھا۔ پٹھانوں میں جرگہ فیصل مقدمات کرتا ہے۔ قبائل جو کسی حکومت کے آگے سر نہیں جھکاتے جرگہ کا فیصلہ ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پرھیا اور جرگہ میں مقدمات کا فیصلہ فوری طور پر کر دیا جاتا ہے اور لوگ عدالتوں کے چکروں سے بچ جاتے ہیں۔

بردہ فروشی

غلامی کا ادارہ زرعی معاشرے کے تشکیل پذیر ہوتے ہی قائم ہو گیا تھا۔ شروع شروع میں جنگی قیدیوں کو جان سے مار دیتے تھے پھر انہیں غلام بنا کر ان سے کھیتی باڑی، کشتی رانی اور گھریلو کام لینے لگے۔ غلامی معاشرے میں لونڈیاں اور غلام اپنے آقا کی شخصی املاک میں شمار ہوتے تھے۔ آقا غلاموں سے ہر قسم کی مشقت لینے اور لونڈیوں کو خلوت میں بلانے کا مجاز تھا۔ مرور زمانہ سے غلاموں اور لونڈیوں کی خرید و فروخت کا کاروبار شروع ہو گیا۔ ہر شہر میں ایک بازار اس کاروبار کے لئے مخصوص تھا جسے عرب سوق النخاس کہتے تھے۔ مصر قدیم، بابل، کنعان، یونان، رومہ وغیرہ ممالک میں غلامی ہی پر معاشرے کا ڈھانچہ قائم تھا اور غلاموں کی محنت و مشقت ہی امراء کو عیش و عشرت کا سامان فراہم کرتی تھی۔ افلاطون اور ارسطو جیسے وسیع النظر فلاسفہ بھی غلاموں کے وجود کو کسی مملکت کی فلاح کے لئے لازم خیال کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ انہیں شہری حقوق دینے کے مخالف تھے۔ یونانی کہا کرتے تھے کہ بچے پیدا کرنے کے لئے بیوی، تفریح طبع کے لئے کسبیاں اور صحت کو بحال رکھنے کے لئے لونڈیاں رکھنا ضروری ہے۔ سپارٹا میں غلاموں کی اکثریت تھی چنانچہ وہاں کی حکومت چوری چھپے غلاموں کو قتل کراتی رہتی تھی مبادا غلاموں کو اپنی اکثریت کا شعور ہو جائے اور وہ بغاوت پر کمربستہ ہو جائیں۔ غلاموں کے کندھوں پر آقا اپنا خاص نشان داغ دیتے تھے تاکہ وہ بھاگ جائیں تو انہیں پکڑا جا سکے۔ مفرور غلام کی سزا موت تھی۔ کسی کے بھگوڑے غلام کو پناہ دینا بھی سنگین جرم تھا۔ رومہ کے غلاموں کی سپارٹاکس کی سرکردگی میں بغاوت، تاریخ حریت کا ایک سنہرا باب ہے۔ غلاموں نے سرکاری فوجوں کو کئی بار شکستیں دیں لیکن آخر مغلوب ہوئے۔

اسے پین کی شاہراہ پر سُولیاں نصب کر کے ہزاروں غلاموں کو ان پر گاڑ دیا گیا۔ آقاؤں اور غلاموں کی آویزش بعد میں جاگیرداروں اور مزارعوں کی چپقلش میں بدل گئی۔

موروثی غلامی کا بدترین ادارہ ہندوستان میں ذات پات کی تمیز کے نام سے قائم کیا گیا۔ اس کی تفصیل علاحدہ باب میں درج کی گئی ہے۔ روم میں بعض اوقات آقا اور غلام میں تحریری معاہدہ ہو جاتا کہ غلام مُقررہ رقم ادا کر کے آزادی حاصل کرے گا۔ کوٹلیہ نے ارتھ شاستر میں لکھا ہے کہ کسی لونڈی کے ہاں بیٹا پیدا ہو تو لونڈی اور اُس کا بیٹا آزاد ہو جائیں گے لیکن ان کا تعلق آقا کے قبیلے سے بدستور قائم رہے گا۔ مکاتبہ اور مولی کے نام سے یہ قواعد عربوں میں بھی بار پا گئے۔ لونڈیوں اور غلاموں کو تحفے کے طور بھی ایک دوسرے کو دے دیا کرتے تھے۔ روم کے ایک رئیس پلاٹی نس نے ایک سَو غلام ہیجڑے بنوا کر اپنی بیٹی کے جہیز میں دیئے تھے خسرو پرویز نے قیصر باز نطین کو ایک دفعہ ایک سو خوبصورت تُرک غلام تحفے میں بھیجے جن کے کانوں میں سونے کے بالے تھے اور بالوں میں موتی جڑے تھے۔ اس کے جواب میں قیصر نے خسرو پرویز کو بیس پری چہرہ لونڈیاں بھیجی تھیں جن کے سروں پر سونے کے تاج تھے۔ ظہیر الدین بابر نے اپنی تُوزک میں دو چرکسی لونڈیوں کا ذکر کیا ہے جو شاہ ایران نے تحفتہً اُسے بھیجی تھیں۔ یحییٰ برمکی نے ہارون الرشید کو ایک حسین رُومی لونڈی ھیلانہ تحفے میں دی تھی۔

اسلام سے قبل قریش غلاموں کی تجارت کرتے تھے۔ لونڈیوں غلاموں کا شمار ترکے میں بھی ہوتا تھا البتہ مُدبّر — جنہیں آقا کہتا کہ میری موت پر تم آزاد ہو جاؤ گے — آقا کی موت پر آزاد ہو جاتا تھا۔ بعض اوقات آقا اپنے غلام بیٹے کو غیر معمولی شجاعت دکھانے پر آزاد کر دیتا تھا۔ جیسا کہ عنترہ بن شدّاد سے ہوا۔ جب کوئی شخص غلام خریدتا تو اس کے گلے میں رسّی ڈال کر اپنے گھر لے جاتا تھا۔ جنگ میں غلاموں کے حصّے کا مال غنیمت آقا کو ملتا تھا بعض اوقات کوئی شخص جوئے میں اپنی آزادی ہار دیتا تو وہ جیتنے والے کا غلام بن جاتا تھا۔ ابولہب نے عاص بن ہشام کو جوئے میں اپنا غلام بنا کر اُسے اونٹ چرانے پر مامور کر دیا تھا۔ آزادی خریدنے کے بعد غلام اپنے آقا کا مولی بن

جاتا تھا۔ حرب باپ اور لونڈی ماں کے بیٹے ہجین (دو غلے) کہلاتے تھے جنہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ غلام کو اُس کا نام لے کر بُلانا معیوب تھا۔ اِسے تالی پیٹ کر بُلایا کرتے تھے۔

مسلمان حکمرانوں نے رومیوں کی پیروی میں اپنی حرم سراؤں میں لونڈیوں کی حفاظت پر خواجہ سرا یا ہیجڑے مامور کئے۔ بردہ فروشی کا کاروبار بنو عباس کے دورِ حکومت میں چمک اٹھا۔ بردہ فروش لگاؤ لونڈیوں کو لباسِ فاخرہ پہنا کر نخاس میں لاتے تھے۔ اس خاص لباس کو معرض کہا جاتا تھا۔ خریدار غلاموں اور لونڈیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر خریدتے تھے۔ سفید فام غلاموں اور لونڈیوں کو صقالبہ کہتے تھے۔ رُومی، چرکسی اور تُرکی لونڈیاں گراں قیمت سمجھی جاتی تھیں اور انہیں صرف سلاطین اور اُمرا ہی خرید سکتے تھے۔

بنو عباس کے عہدِ حکومت کا سب سے مشہور بردہ فروش ابن زمن تھا۔ اُس نے ایک کنیز ربیعہ ایک لاکھ میں، دوسری سعدیٰ نوّے ہزار میں اور تیسری زرقا، اسّی ہزار درہم میں بیچی تھی۔ ہارون الرشید نے ذات الخال کو ستّر ہزار درہم میں خریدا تھا۔ خلفائے بنو عباس کی غالب اکثریت لونڈیوں کے بطن سے تھی۔ ہارون الرشید کی ماں خیزراں اور مامون رشید کی ماں مراجل عجمی لونڈیاں تھیں۔ بردہ فروش لونڈیوں کو گانے اور ناچنے کی تربیت دلا کر بازار میں لاتے تھے۔ مصر میں سفید فام لونڈی کو جاریہ بیضا اور سیاہ فام کو جاریہ سودا کہا کرتے تھے۔ ترکستان سے ہر سال سیکڑوں خوبرو غلام اور لونڈیاں خراج میں بھیجی جاتی تھیں۔ بلاذری لکھتا ہے کہ الخزر کا حکمران ہر سال ہشام بن عبد الملک کو پانچ سو غلام اور پانچ سو "آہو چشم لونڈیاں جن کے بال سیاہ، بھویں گھنی اور پلکیں لمبی ہوں" خراج میں بھیجا کرتا تھا۔ اشبیلیہ کے قصر میں دالان بکر آج بھی موجود ہے جس میں عیسائی بادشاہوں کی طرف سے خراج میں

---

[1] فتوح البلدان

بھیجی ہوئی نوخیز لڑکیاں رکھی جاتی تھیں۔ لونڈیوں کی نگرانی پر خواجہ سرا مامور تھے۔ اطالیہ کے شہر وینس میں نوعمر لڑکوں کو ہیجڑے بنا کر اسلامی ملکوں کو برآمد کیا جاتا تھا۔ یہ کاروبار اکثر و بیشتر یہودیوں کے ہاتھوں میں تھا۔ عربوں نے ایران، شام، فلسطین اور ماوراء النہر کے علاقے فتح کئے تو ہزاروں غلاموں اور کنیزوں کے قافلے مدینہ پہنچنے لگے جو بنو امیہ کے زمانے میں گانے اور ناچ کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ جنگی غلاموں کو ان کے کندھوں میں سوراخ کر کے تسمے ڈال کر گھوڑے یا اونٹ کی دُم سے باندھ دیتے تھے۔ اور وہ پیچھے پیچھے دوڑتے جاتے تھے۔ ہندوستان سے محمود غزنوی، تیمور لنگ، نادر شاہ افشاد اور احمد شاہ ابدالی لاکھوں لونڈیاں غلام خراسان اور ایران لے گئے جہاں انہیں کوڑیوں کے مول بیچا گیا۔ آقا اپنے غلاموں کے کانوں میں حلقہ ڈال دیتے تھے۔ حلقہ بگوش کی ترکیب اسی رسم سے یادگار ہے۔ چینیوں اور منگولوں میں دستور تھا کہ بادشاہ کی موت پر منتخب لونڈیاں میت کے ساتھ دفن کر دی جاتی تھیں تاکہ بادشاہ سلامت اگلے جہان میں اکتاہٹ اور تنہائی محسوس نہ کریں۔ بادشاہ سیکڑوں غلام اپنی خدمت کے لئے رکھتے تھے۔ محمد غوری اور فیروز شاہ تغلق کے ہزاروں ذاتی غلام تھے۔ علاؤالدین خلجی نے دوسرے اجناس کی طرح غلاموں اور لونڈیوں کی قیمتیں بھی مقرر کر دی تھیں۔ اس پہلو سے جلال الدین اکبر بڑا روشن خیال تھا۔ اس نے اپنے ہزاروں غلام جو چیلے کہلاتے تھے آزاد کر دیئے اور انہیں دلی کے ایک محلے میں بسا دیا جسے کوچہ چیلاں کہتے ہیں۔

موالی کا درجہ حر اور غلام کے بین بین تھا۔ موالی اپنے آقا کے قبیلے سے وابستہ رہتے تھے۔ غلاموں کا ایک طبقہ قن کہلاتا تھا جن سے کھیتی باڑی کا کام لیا جاتا تھا۔ وسطی زمانے کے روس اور یورپ کے کھیت غلاموں کی طرح انہیں اراضی کے ساتھ بیع کر دیا جاتا تھا۔

تاریخ عالم میں سب سے پہلے یونانی فلسفی ارسطو نے انسداد غلامی کی روایت قائم

کی۔ اُس نے وصیت لکھی کہ میری موت کے بعد میرے سب لونڈی غلام آزاد کر دیئے جائیں۔ سلطان محمود خاں عثمانی (۱۸۰۲ــــ۱۸۲۹ء) نے غلامی کے رواج کو موقوف کیا اور تمام یونانی جو بطور جنگی غلام پکڑے گئے تھے آزاد کر دیئے۔ مغرب میں ڈنمارک کی حکومت نے غلامی کو خلافِ قانون قرار دیا۔ انگلستان نے ۱۸۰۷ء میں اِس کی تقلید کی اور دوسرے ممالک کے اہلِ خرد نے غلامی کی لعنت کا خاتمہ کرنے کی تحریک جاری کی۔ ایالاتِ متحدہ امریکہ میں جنوبی ریاستوں کے حبشی غلاموں کو آزاد کرانے کے لیئے صدر لنکن کو ایک طویل خونریز جنگ لڑنا پڑی تھی۔

بنج بیوہار

پُرانے وقتوں میں مال کے بدلے مال لینے کا چلن تھا مثلاً گائے کے بدلے میں بیل یا بھیڑ کے بدلے میں بکری لے لیتے تھے۔ سِکّے کا رواج پہلے پہل مصرِ قدیم میں ہوا۔ کوڑی سب سے پہلا سِکّہ تھا۔ اس کے بعد کانسی، تانبے، چاندی سونے کے سِکّے ڈھالے گئے۔ سپارٹا والوں نے لوہے کا سِکّہ چلایا۔ سِکّے عموماً چوکور یا گول وضع کے ہوتے تھے جن میں سوراخ ہوتا تھا تاکہ انہیں رسّی میں پرو کر کمر سے لپیٹا جا سکے۔ یونان میں دینار سونے کا اور درہم چاندی کا سِکّہ تھا۔ درہم کا معنیٰ ہے "مٹھی بھر" (جَو یا گندم) ایک دینار دس درہم کے برابر تھا۔ بعد میں یہ سِکّے رومہ کے توسّط سے دنیا کے دُور دراز کے مُلکوں میں بھی رواج پا گئے۔ بعض عرب ممالک میں آج بھی ان کا چلن ہے۔ یُونانیوں کا سب سے کم قیمت کا سِکّہ اوبول کانسی کا تھا۔ ایران میں اس کا رواج پول کے نام سے ہوا۔ ایک درہم چھ اوبول کے برابر تھا۔ ایرانی اور بازنطینی سِکّے خاص طور سے خوبصورت ہوتے تھے۔ ایران کے سِکّوں پر بالعموم تیر انداز کا نقش ہوتا تھا۔ چین میں زرِ کاغذ کا اجرا ہوا جسے آج کل کرنسی نوٹ کہتے ہیں اور جو دنیا بھر کے ممالک میں رواج پذیر ہے۔

مسلمانوں کی آمد سے پہلے شمال مغربی ہند میں دِہلی وال سِکّہ چلتا تھا چیتل اسی کے نمونے پر ڈھالا گیا۔ بہلول لودھی نے چیتل کے بجائے بہلولی کو رواج دیا۔ اِل تمش نے چاندی کا ٹنکہ جاری کیا جو مغولوں کے ٹنکہ کی بدلی ہوئی صورت تھی۔ دام، فلوس اور پیسہ سب سے کم قیمت کے تانبے کے سِکّے تھے۔ چالیس پیسوں کا ایک ٹنکہ بنتا تھا۔ اشرفیاں سونے کی ڈھلوائی جاتی تھیں لیکن لین دین میں نہیں برتی جاتی تھیں۔

محض نذرانہ دینے کے کام دیتی تھیں۔ خراسان میں مرزا شاہ رُخ نے شاہرُخی جاری کی جس کا وزن ایک چوتھائی مثقال کا تھا۔ بادشاہ کی سواری نکلتی تو اُس پر سکّے نچھاور کیے جاتے تھے۔ جہانگیر نے اس مقصد کے لئے خاص سکّے ڈھلوائے جنہیں نثار کہتے تھے۔ جنوبی ہند میں ہُن سونے کا سکّہ تھا۔ ہُن برسنے کا محاورہ اِسی سے یادگار ہے۔ یہ گول بٹن کی وضع کا ہوتا تھا۔ مغلوں نے روپیہ (رُوپا بہ معنیٰ چاندی) چلایا جو چالیس دام کے برابر تھا۔ جلال الدین اکبر کے حکم پر ٹنکہ اور مُہر پر تاریخ الف ثبت کرائی گئی۔ اِس کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ ایک ہزار سال گذر چکے ہیں اور اسلام کا دَور گذر چکا ہے، اب دینِ الٰہی کا دَور ہے۔

قدیم ہندوستان میں پنڑا اور پنڑس کے تانبے اور کانسی کے سکّے چالو تھے جن کا ذکر منوسمرتی میں آیا ہے۔ یہ ایک قدیم روایت ہے کہ بادشاہ تختِ نشینی کے وقت اپنے نام کے سکّے چلاتے تھے۔ سکّوں پر پھول پتّوں اور جانوروں کے نقوش ہوتے تھے یا بادشاہ کی شبیہ نقش کی جاتی تھی۔ ایتھنز کے سکّے پر اُلّو کی شبیہ ہوتی تھی جو اتھینا دیوی کا مقدس پرندہ تھا اور عقل و خرد کا پیکر سمجھا جاتا تھا۔ شمال مغربی ہند میں باختری یونانیوں کے سکّے خاص طور سے خوبصورت ہوتے تھے۔ مغربی ممالک میں ہر قوم کے خاص سکّے چلتے رہے ہیں مثلاً ڈالر امریکہ کا، پونڈ انگلستان کا، روبل رُوس کا، مارک جرمنی کا، فرانک فرانس کا وغیرہ۔ سکھ روپے پیسے کو نانک شاہی کہتے تھے۔ عوام روپے کو پُولا یا چھلڑا، اٹھنّی کو دھیلی، چونّی کو پُولی کہتے رہے ہیں۔

قدیم زمانوں میں فنیقی، بابلی اور عرب بڑے بڑے اولوالعزم تاجر تھے جو دُور دُور کے ملکوں تک تجارت کا مال لے جاتے تھے۔ عراق میں بابل کا شہر لین دین کی بہت بڑی منڈی بن گیا تھا جہاں سے تاجروں کے قافلے چین، روما اور ہندوستان کو جاتے تھے۔ فنیقیوں کے ارغوانی اور قرمزی رنگ کے پارچے شاہی درباروں میں بڑے مقبول تھے۔ فنیقی ایک قسم کی مچھلی سے جسے صدف ماہی کہتے تھے قرمزی رنگ حاصل کرتے تھے۔ ارغوانی رنگ شاہ بلوط کی ایک خاص قسم سے نکالا جاتا تھا۔

وادیٔ سندھ میں دنیا بھر میں سب سے پہلے چاول اور کپاس کی فصلیں اُگائی گئیں۔ انہیں کشتیوں میں لاد کر عراق کو برآمد کیا جاتا تھا۔ موئن جو دڑو اور ہڑپا کے شہروں سے سُمیریا کی کچھ مہریں دستیاب ہوئی ہیں جو سکوں کے بطور استعمال کی جاتی تھیں۔ دراوڑوں کے جو باٹ ملے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لین دین کے کھرے تھے۔

عرب تاجروں کے جہاز ساحل کارومنڈل اور جزائر شرق الہند سے گرم مصالحہ اور خوشبویات: اگر، مُر، چندن، کیسر وغیرہ مغربی ممالک کو لے جاتے تھے۔ ملایا کا ربڑ اور گری کھوپا بھی یورپ کو پہنچایا جاتا تھا۔ کنعانی وسیع پیمانے پر ہاتھی دانت کی تجارت کرتے۔ چین سے ریشم کے لچھے اور ریشمی پارچے شاہراہِ قراقرم یا شاہراہِ ریشم سے مغرب کو جاتے تھے۔ مغلیہ دَور میں ایران اور خراسان کے تاجروں کے قافلے جنوبی ہند تک جاتے تھے۔ بنجارے (بنج بیوپار کرنے والے) بیلوں پر غلّہ لاد کر ملک بھر میں فروخت کرتے تھے۔ چل پھر کر کپڑا بیچنے والوں کو پراچے (پارچہ سے) کہتے تھے۔ یہ ایسے کایاں تھے کہ اروڑے یا بنیئے بھی ان کے آگے کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے۔

ہندوستان میں بِکری بڑھانے کے لئے دکان کی دیواروں پر سواستکا کا نشان بنانے کا رواج تھا۔ اس مقصد کے لئے ایرانی دکاندار پنجہ کا نشان لگاتے ہیں۔ کوئی مقروض قرض ادا کئے بغیر مر جاتا تو اُس کے بیٹوں کو مقررہ مدت تک قرضخواہ کی چاکری کرنا پڑتی تھی۔ پنجابی میں اس رسم کو سرگانا کہتے ہیں۔ بعض اوقات قرض کی وصولی کے لئے مقروض کا جنازہ روک لیا جاتا تھا۔ جب تک گھر والے قرض ادا نہ کرتے جنازہ اُٹھانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی جیسا کہ مرزا غالب کی وفات پر ہوا تھا۔ حیدرآباد دکن، اڑیسہ اور بہار میں آج بھی یہ رواج موجود ہے کہ قرض خواہ نادھند مقروض کے دروازے کے سامنے دھرنا مار کر بیٹھ جاتا ہے اور رقم کی وصولی کے بغیر دروازے سے اُٹھنے کا نام نہیں لیتا۔ ایک رواج یہ تھا کہ کوئی تاجر کنگال ہو جاتا اور لوگوں سے لیا ہوا قرض ادا نہ کر سکتا تو وہ کسی دن صبح سویرے اپنی دکان کے سامنے دو چراغ (دیا) جلا کر رکھ دیتا تھا۔ لفظ دیوالیہ دیا یا دیوا ہی سے مشتق ہے۔ آج کل ساہوکار زیادہ تر یورپ اور امریکہ کے یہودیوں کے ہاتھوں میں ہے جو اس کے ذریعے دُنیا بھر کے ممالک پر اپنا معاشی تسلّط قائم کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔

توہمّات

نوعِ انسان کو جادو، تسخیرِ جن، شمن مت، فال گیری، حاضرات ارواح، غیب بینی اور نظرِ بد کے توہمّات قدیم بابل سے ورثے میں ملے ہیں۔ وضاحت کے لئے چند روزمرّہ کے توہمّات کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

بارش نہ ہو تو کسی نیک آدمی پر پانی لنڈھایا جاتا ہے، باری کا بخار نہ اُترے تو عورتیں کسی کانٹے دار جھاڑی سے ہمکنار ہوتی ہیں یا چرائے ہوئے مُرغے کا گوشت کھایا جاتا ہے، کسی کے سر پہ آسیب کا سایہ ہو تو اُس کے سر پر چھاج پھٹکتے ہیں اور جھاڑ پھونک کرتے ہیں، پھونک مار کر اپنی برکت دوسرے آدمی میں منتقل کر دی جاتی ہے، عورتیں کسی شخص کے چہرے کے گرد اپنی باہیں پھیلا کر اور پھر اپنے ہاتھوں کو اپنے سر تک لا کر گویا اُس کی بلائیں اپنے سر لے لیتی ہیں، وسطی ہند میں درخت کاٹنے سے پہلے لکڑ ہارا درخت سے معافی مانگتا ہے، آئرلینڈ میں میں سُرخ بالوں والا شخص منحوس سمجھا جاتا ہے، لوگ تیرہ نمبر کی نشست پر بیٹھنے سے گھبراتے ہیں مبادا اُن پر کوئی آفت ٹوٹ پڑے، کھانے کی میز پر نمک گر جائے تو اُسے کسی سانحے کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے۔ ہندو جادوگر لکشمی دیوی کی پوجا اُس کے سامنے برہنہ ہو کر کرتے ہیں جب کہ رام کے بُت کے سامنے پورے کپڑے پہن کر جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں چوری کا سراغ لگاتے وقت کوزہ پھراتے ہیں جب کہ ایران میں اس مقصد کے لئے قرآن گردانی کی رسم ہے۔ چوری کا سراغ لگانے کے لئے کسی کرنجی آنکھوں والے لڑکے کو جادو کا کاجل لگایا جائے تو وہ چوری کا مال دیکھ لیتا ہے۔ جس آدمی کے پاس چنتامنی پتھر ہو وہ امیر کبیر ہو جاتا ہے۔ شیر کا ناخن نظرِ بد سے محفوظ رکھتا ہے وغیرہ۔

مندرجہ بالا توہمات قانون سبب و مُسبّب سے آزاد ہیں اور اُن وقتوں سے یادگار ہیں جب چاروں طرف جہالت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور سائنس نے ابھی فطرت کے قوانین دریافت نہیں کئے تھے۔ جادو بھی اسی ہمہ گیر اور اتھاہ جہالت کا کرشمہ تھا۔ جادو کی دو معروف قسمیں ہیں: سفید اور کالا۔ سفید جادو میں نیک روحوں سے رجوع لا کر فائدہ پہنچایا جاتا ہے، کالے میں بد روحوں سے استمداد کر کے کسی کو ضرر پہنچاتے ہیں۔ شہر بابل جادو کا گڑھ تھا جہاں سے جادو کے ٹونے ٹوٹکے دنیا بھر کے علاقوں میں پھیل گئے۔ جنگلی اقوام میں کوئی شخص بیمار پڑ جائے تو کہتے ہیں اس پر جادو کر دیا گیا ہے۔ ہسپانیہ جیسے مہذب ملک میں آج کل بھی عوام مریض کو ڈاکٹر کے بجائے کسی جھاڑ پھونک کرنے والے پادری کے پاس لے جاتے ہیں۔ افریقہ، آسٹریلیا، ملائشیا، شرق الہند وغیرہ کے جنگلی قبائل میں جن گیر، جادوگر، مینہ برسانے والا، سیانا اور عامل ایک ہی ذات میں جمع ہوتے ہیں۔ ایران میں کسی شخص پر جادو کرنا مقصود ہو تو اُس کے بال، ناخن اور پیروں کے نیچے کی خاک لے کر اُس پر کلام پڑھتے ہیں۔ سفید مُرغے کے خون سے ٹونے ٹوٹکے لکھے جاتے ہیں۔ آج کل اظہارِ نفرت کے لئے کسی کا پُتلا جلانے کی رسم قدیم جادو سے یادگار ہے جب کسی کو جان سے مارنے کے لئے ایسا کرتے تھے۔ جادوگرنیاں بعض اوقات منتر پڑھ کر دھاگے میں گرہ ڈال دیتی ہیں تو اُن کے دعوے کے مطابق گائے بھینس دُودھ دینا بند کر دیتی ہے یا مرد جنسی ملاپ کے قابل نہیں رہتا یا کسی کا پیشاب روک دیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ سندھ میں جادوگرنیاں خوبصورت نوجوانوں کے کلیجے منتر پڑھ کر نکال لیتی ہیں جس سے وہ نڈھال ہو کر مر جاتے ہیں۔ انہیں جگر خور کہتے ہیں۔ ہندوستان میں ہندو عورتیں جادو کرنے کے لئے کسی مخالف عورت کو مسان ــــ مرگھٹ کی ہڈیوں کی راکھ ــــ کھلا دیتی ہیں تاکہ وہ کسی موذی مرض میں مبتلا ہو جائے۔ مسان کے علاج کے لئے چُوہڑے مریضہ کے سامنے بیٹھ کر ڈھولک اور چمٹا بجاتے ہیں اور شبد گاتے ہیں۔ اگر واقعی مسان کھلائی گئی ہو تو عورت کو حال آجاتا ہے، وہ سر کے بال کھول دیتی ہے اور زور زور سے سر ہلانے لگتی ہے۔ اسے مسان کھیلنا کہتے ہیں۔ پنجاب میں عورتیں

خاوندوں پر قابو پانے کے لئے انہیں تعویذ گھول کر پلا دیتی ہیں، جس گھر میں لڑائی کرانا مقصود ہو اُس کے کسی کونے میں تعویذ دفن کر دیتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس سے گھر میں دائماً کھٹ پٹ شروع ہو جاتی ہے۔ بعض جادوگرنیاں مادر زاد برہنہ گورستان میں جا کر بچوں کی نعشیں نکال لیتی ہیں اور مُردوں کی ہڈیوں سے بنائی ہوئی مالا پر منتر پڑھتی ہیں۔ کسی کو جان سے مارنا ہو تو کھوپڑی کو ہڈیوں سے بجا بجا کر منتر پڑھتی ہیں۔ مغرب میں جادوگرنیاں کسی خُفیہ مقام پر رات کو مِل بیٹھتی ہیں۔ ایک مُرتد پادری اُلٹی آیات پڑھتا ہے۔ بلّی کے بچے کا خُون کسی نیم برہنہ لڑکی کے سینے پر چھڑکا جاتا ہے۔ پھر سب مِل کر شیطان کی پُوجا کرتے ہیں کیوں کہ وہ جادوگروں کا اُستاد ہے۔ شیطان مت کے پیرو یورپ کے بڑے بڑے شہروں میں چھُپ چھُپ کر جنسی بے راہ روی کے شرمناک مظاہرے کرتے ہیں۔

پندرھویں صدی میں ایک فرانسیسی جادوگر بیرن لاداں نے جادو کرنے کے لئے دو سَو بچوں کا خُون بہایا تھا تاکہ وہ شیطان کو اپنے قابو میں لا کر اُس سے کام لے سکے۔ آخر پکڑا گیا اور اُسے سُولی پر گاڑ دیا گیا۔

ہندو جادو کو اِندر جال کہتے ہیں۔ اُن کی بعض رسمیں برہنہ ہو کر ادا کی جاتی ہیں مثلاً جنوبی ہند میں مینہ برسانے کا ایک ٹوٹکا یہ ہے کہ تین عورتیں کپڑے اُتار کر کھیت میں ہل چلاتی ہیں۔ دو بیلوں کی طرح ہل میں جُت کر اُسے کھینچتی ہیں اور تیسری ہتھی کو تھام لیتی ہے۔ ظہیر الدین بابر نے اپنی تُوزک میں مینہ روکنے کا ایک ٹوٹکا درج کیا ہے۔

"مُوسلا دھار مینہ برسنے لگا۔ مجھے ایک ٹوٹکا معلوم تھا۔ میں نے اُسے مُلا علی جان کو سکھا دیا جس نے اُسے کاغذ پر لکھ کر اُس کے چار ٹکڑے کئے اور قیام گاہ کے چاروں کونوں میں لٹکا دیا۔
بارش اُسی وقت تھم گئی۔"

ہمارے ہاں راول جوگی منتر پڑھ کر اُمڈتی ہوئی گھٹا کو برسنے سے روک دیتے ہیں اسی لئے انہیں رتھ بندھ کہتے ہیں۔ حُب کے ٹونے ٹوٹکے تمام اقوام میں رائج رہے ہیں۔ اِن کا مقصد عورت کا دِل جیتنا اور اُس پر قابو پانا ہوتا

ہے۔ سنسکرت میں اِس جادو کو وشیکرن کا نام دیا گیا ہے۔ لونگ پر منتر پڑھ کر عورت کو کھلا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ کھلانے والے پر فریفتہ ہو جاتی ہے۔ اتھروید میں حُب کے کئی منتر دکھائی دیتے ہیں۔ ایک منتر بطور نمونہ درج ذیل ہے۔

"میری زبان کے سرے پر شہد ہو، میری باتوں میں شہد کی مٹھاس ہو۔

تاکہ میری پریمیکا مجھ پر فدا ہو جائے اور اُس کا بدن میرے قابو میں آجائے"

بعض مکّار عامل سُرمے پر دم کر کے عاشق کو دیتے ہیں اور اُس سے خاصہ معاوضہ بٹور لیتے ہیں۔ اُسے کہتے ہیں کہ یہ سُرمہ اپنی آنکھوں میں لگا کر محبوبہ کے پاس جاؤ وہ تمہارے پیار میں دیوانی ہو جائے گی۔

فال گیری اور غیب بینی کے طریقے بہت پُرانے ہیں۔ قدیم یونانی اور رومی گدھوں اور کبوتروں کی اُڑان سے فال لیا کرتے تھے۔ بابل میں ذبیحہ کی انتڑیوں سے فال لی جاتی تھی۔ عرب کوّے سے فال لیتے تھے اور ہجر و فراق کا ذمّے دار غراب البین (جدائی کے کوّے) کو ٹھہراتے تھے۔ ریت (رمل) پر لکیریں کھینچ کر بھی فال لی جاتی تھی چنانچہ فال گیر کو رمّال کہا کرتے تھے۔ جپسی عورتیں تاش کے پتوں، ہاتھ کی لکیروں اور بلور میں گھور کر غیب کا حال بتلاتی ہیں۔ دلفی کے مندر کی کاہنہ مستی کے عالم میں غیب کی خبر دیتی تھی۔ مصر قدیم میں آمون رع کے مندر کا بڑا کاہن پیش گوئی کیا کرتا تھا۔ ہندوستان میں برہمن اور ایران میں مُغ غیب بینی کرتے رہے ہیں۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ ولایتیوں کے دستر خوان پر اکثر دیکھا گیا ہے کہ پلاؤ کے قابوں میں جب شانہ کی ہڈی ثابت نکل آتی تو بعض اشخاص استخوان مذکور کو ورق کتاب کی طرح دیکھتے ہیں اور غائب کی خبر دیتے ہیں۔ اِسے شانہ بینی کہتے ہیں۔ فردوسی نے ایک فرشتے سروش کا ذکر کیا ہے جو فریدون کو غیب کی باتیں بتلاتا تھا۔

شمن مت کا آغاز یورال التائی سے شروع ہو کر منگولیا، تبت، چین، شمالی امریکہ کے

لال ہندیوں اور ملایا تک پھیل گیا۔ سائبیریا کے شمن (لغوی معنی: بزرگ، سیانا) مَت میں علاج امراض اور غیب کا حال بتلانے کے لئے رُوحوں سے رجوع لاتے تھے۔ ترکستان اور ملایا میں شمن انسانوں اور رُوحوں کے مابین ضروری واسطے سمجھے جاتے تھے۔ شمن ہمیشہ وجد و حال کے عالم میں پیش گوئی کیا کرتا تھا۔ عقیدہ یہ تھا کہ از خود رفتگی کے عالم میں شمن کی زبان سے رُوحیں کلام کرتی ہیں۔ اِس حالت میں شمن کی رُوح اپنے بدن سے جُدا ہو کر کسی مُردہ آدمی یا جانور کے قالب میں منتقل کی جا سکتی ہے۔ شمن چوری کا مال معلوم کرنے اور دفینہ کی جگہ کا کھوج لگانے کے لئے بھی رُوحوں سے رابطہ پیدا کرتا تھا۔ شمن پر بے خودی کی کیفیت طاری کرنے کے لئے بخور جلاتے اور ڈھول پیٹا کرتے تھے جس سے شمن زور زور سے سر ہلانے لگتا اور پھر چراغ کی لَو میں گھور کر غیب کی باتیں بتاتا تھا۔ جس بدرُوح نے مریض کو پکڑا ہوتا وہ بھی شمن کے سامنے حاضر ہو جاتی اور وہ اپنے ہمزاد کی مدد سے اُسے بھگا دیتا تھا۔ انقلاب کے بعد رُوسی حکومت نے سائبیریا میں شمن مَت کا استیصال کر دیا لیکن ملایا میں آج بھی شمن اپنا کاروبار کر رہے ہیں۔ شمن اور جادوگر میں فرق ہے۔ شمن ہمزاد کی مدد سے بدرُوحوں کو بھگا دیتا ہے جب کہ جادوگر منتروں کے زور سے بدارواح پر قابو پا لیتا ہے۔ افریقہ کے وحشی قبائل میں بعض جادوگر نکالی ہوئی بدرُوحوں کو پنجرے میں بند کر کے لئے پھرتے ہیں۔ اضلاعِ متحدہ امریکہ میں حاضرات اَرواح اور بلور میں گھورنے کا جو چکّر چلا تھا وہ لال ہندیوں کے شمن مَت ہی سے ماخوذ تھا۔

منگول شمن مَت کے پیرو تھے اور شمنوں کے توسّط سے آسمانوں کی رُوح تنگری سے رابطہ پیدا کر کے اِس سے مدد مانگتے تھے۔ ہمارے ہاں کے عامل چِلّہ کاٹ کر تسخیرِ جن کرتے ہیں۔ عامل کسی کھوہ میں ڈیرا جما لیتا ہے اور چالیس روز تک تسخیرِ جن کا افسوں پڑھتا ہے۔ اس دوران میں وہ برائے نام کچھ کھا پی لیتا ہے اکثر فاقہ کرتا ہے۔ بعض عامل پہلے روز ایک بادام کھاتے ہیں اور پھر ہر روز ایک ایک بادام کا اضافہ

کرتے جاتے ہیں۔ شروع شروع میں عامل کو جنات کی ڈراونی شکلیں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ ثابت قدم رہے تو چالیسویں روز شاہِ جنات حاضر ہو جاتا ہے اور کسی جن کو عامل کی خدمت پر مامور کر دیتا ہے۔ عامل جو بھی حکم دے وہ جن فی الفور بجا لاتا ہے۔ یہی تسخیرِ جن ہے۔ عامل اپنے جن کی مدد سے گمشدہ چیزوں کا احوال معلوم کر لیتا ہے۔ جن مردوں عورتوں کو جن کی پکڑ ہو جائے عامل انہیں اُلٹا لٹکا کر سُرخ مرچوں کی دھونی دیتا ہے اور بے تحاشا اُس کی پٹائی کرتا ہے۔ اس کے ساتھ کہا جاتا ہے بڑا سرکش جن ہے۔ آخر میں پکڑنے والے جن کو حضرت سلیمان کا واسطہ دیا جاتا ہے جس سے وہ خوفزدہ ہو کر بھاگ جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جن نمک، لوہے، حرمل، مہندی اور چمڑے سے دور بھاگتے ہیں، تیز روشنی کے قریب بھی نہیں پھٹکتے۔ بعض اوقات جن نکالنے کے لئے روئی کی بتی بٹ کر اور اُس پر دم کر کے چراغ میں جلاتے ہیں۔ اسے پلیتہ کہتے ہیں۔

اسلامی ممالک میں یہ عقیدہ راسخ ہو چکا ہے کہ نظرِ بد نہایت ضرر رساں ہوتی ہے۔ اِس کی تہ میں حسد، رشک یا لالچ ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ کبڑے، بونے، لولے، لنگڑے، کانے، بہرے اور بدشکل آدمی کی آنکھوں میں نظرِ بد ہوتی ہے کیوں کہ وہ ہمیشہ صحت مند اور خوبصورت لوگوں کو حسد اور رشک کی نگاہ سے دیکھتے رہتے ہیں۔ اسی طرح بانجھ عورت کی نظر بڑی ضرر رساں سمجھی جاتی ہے۔ بعض اوقات بیٹوں کو نظرِ بد سے بچانے کے لئے انہیں لڑکیوں کا لباس پہناتے ہیں اور نفرت انگیز ناموں سے پکارتے ہیں یا اُن کی ناک میں بُلاق ڈال دیتے ہیں۔ ہندوؤں میں نظرِ بد سے بچاؤ کے لئے آرتی اُتارنے کا رواج ہے۔ ہندو بدروحوں کو بھگانے کے لئے انگلیاں چٹخاتے ہیں۔ ایران میں نظرِ بد سے بچنے کے لئے فیروزہ انگوٹھی میں پہنتے ہیں۔ ہندوؤں میں رسم ہے کہ بہن اپنے بھائی کی کلائی پر ساون کی کسی اتوار کو راکھی (محافظ) باندھتی ہے جو کئی رنگوں کا بٹا ہوا دھاگا ہوتا ہے جس میں پھندنے لگائے جاتے ہیں۔ عرب شیوخ کی خلیجی ریاستوں میں جو سیاح مغرب سے آتے ہیں اُنہیں کڑی ہدایت کی جاتی ہے کہ میزبان شیخ کے کسی بچے کی تعریف نہ کریں کیوں کہ اس سے نظرِ بد لگ جانے

کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں کسی کی تندرستی کی تعریف کی جائے تو وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے "میاں تھوک دینا" اگر ملنے والا تھوک دے تو نظرِ بد کا خطرہ ٹل جاتا ہے۔ بیس آیلن ڈونالڈسن جو ایران میں کئی برس مقیم رہیں لکھتی ہیں[1]

"اسلامی دنیا میں ہر کہیں نظرِ بد کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ ایران میں چشم زخم اور چشم زدن کی تراکیب اِس سے یادگار ہیں۔ کہتے ہیں کہ بعض مردوں عورتوں کی نگاہ میں ایسی طلسماتی تاثیر ہوتی ہے کہ وہ جس شے یا شخص کو تحسین، لالچ، رشک یا حسد کی نظر سے دیکھیں اُسے لازماً ضرر پہنچتا ہے۔ اِس نوع کی آنکھوں کو چشمِ شور یا چشمِ تنگ کہتے ہیں۔ بسا اوقات نظرِ بد رکھنے والے مردوں عورتوں کو خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ نظرِ بد رکھتے ہیں۔ گھوڑوں اور گائے بیلوں کو نظرِ بد سے بچانے کے لئے فیروزہ کے منکے پرو کر اُن کی گردنوں میں لٹکاتے ہیں۔ عورتیں اپنے بچوں کو نظرِ بد سے بچانے کے لئے چیتے کے ناخن یا ہرن کے سینگ کا ٹکڑا چاندی میں منڈھوا کر اُن کے گلے میں لٹکا دیتی ہیں۔ کسی بچے کی خوبصورتی کی تعریف کرنا نامناسب ہے کیوں کہ اِس طرح نظرِ بد لگ جاتی ہے۔ اگر منہ سے تعریف کا کلمہ نکل ہی جائے تو ماشاء اللہ کہنا ضروری ہے۔"

[1] THE WILD RUE

عِصمت فروشی

عِصمت فروشی کو دُنیا کا قدیم ترین پیشہ کہا جاتا ہے۔ زرعی انقلاب کے بعد جب عورت اپنے اصل مقام سے گر گئی تو اُس کے سامنے گذر بسر کرنے کے دو ہی راستے تھے (۱)۔ یا تو وہ وجہ معاش کے لئے ایک ہی مرد سے وابستہ ہو جاتی (۲)۔ یا مختلف مردوں کے پاس جا کر جسم فروشی کی کمائی کھاتی۔ ایک ہی مرد سے زندگی بھر کا تعلق قائم کرنے سے نکاح یا بیاہ کی رسم چلی اور مختلف مردوں کے پاس جانے سے عِصمت فروشی کے اِدارے نے جنم لیا۔ بعض اہلِ نظر کے خیال میں عِصمت فروشی کی ابتداء مندروں سے ہوئی جہاں دھرتی دیویوں کی پُوجا کی جاتی تھی۔ اِن مندروں میں دیو داسیاں یا مقدس کسبیاں رکھی جاتی تھیں جن سے بُجاری اور یاتری معاوضہ دے کر تمتّع کیا کرتے تھے۔ یہ کاروبار پروہتوں کی تحویل میں تھا جو دیوداسیوں کی کمائی وصول کیا کرتے تھے۔ یہودیّت اور عیسائیت کی اشاعت کے ساتھ بُت پرستوں کے معبد بند کر دیئے گئے اور کاروباری لوگوں نے بے سہارا عورتوں اور زر خرید لونڈیوں سے عِصمت فروشی کا دھندا کرانا شروع کیا۔ شہر شہر قحبہ خانے کھُل گئے جہاں تماش بینوں کو شراب اور عورتیں فراہم کی جاتی تھیں۔

یہ کاروبار اتنا منفعت بخش ثابت ہوا کہ آج امریکہ اور یورپ میں بڑے بڑے قحبہ خانے موجود ہیں جہاں لاکھوں کسبیاں عیش پسند امیروں کی تفریحِ طبع کا سامان مہیّا کرتی ہیں۔

مِصر اور یُونان قدیم میں کسبیوں کے دو طبقے تھے: اعلیٰ اور ادنیٰ۔ اعلیٰ طبقے کی کسبیاں ہٹیرا کہلاتی تھیں اور پڑھی لکھی ہونے کے ساتھ گانے بجانے کی ماہر ہوتی تھیں۔ اُمراء انہیں شادی بیاہ کی دعوتوں

یاس بلاتے تھے۔ ان میں بعض کسبیوں کو بڑی شہرت نصیب ہوئی۔ فرائنی اور لیث کے حسن و جمال اور لطافتِ ذوق کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔ اسپاشیا جو ایتھنز کے حاکم پیریکلیز کی محبوبہ تھی اپنی علمیت اور فصاحت کے لئے دُور دُور مشہور تھی۔ سقراط نے بھی اس کے علمی ذوق کی تعریف کی ہے۔ یونانی اپنی عورتوں کو تعلیم نہیں دلاتے تھے، صرف کسبیاں ہی پڑھ لکھ سکتی تھیں۔ ول ڈیوراں کے بقول یونان میں عورت کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے کسبی بننا پڑتا تھا۔ روم میں کسبیوں کا سب سے بڑا چکلہ سولبورا تھا جہاں رات پر دن کا گماں ہوتا تھا۔ ملاحوں کے لئے ساحلِ سمندر پر دوسرے درجے کی کسبیوں کے چکلے تھے جہاں سدومیوں کے ذوق کی تشفّی کے لئے اَمرد رکھے جاتے تھے۔ چین کے شہروں میں کسبیوں کے چکلے بستی سے باہر تے تھے جہاں چکلوں کے مالک غریب ماں باپ سے اونے پونے نوعمر لڑکیاں خرید کر لاتے تھے۔ انقلاب سے پہلے صرف شنگھائی میں بیس ہزار کسبیاں دھندا کرتی تھیں۔ ہند قدیم میں کسبیوں کی درجہ بندی کر دی گئی تھی۔ اعلیٰ درجے کی کسبیاں ویشیا یا نرتکی کہلاتی تھیں۔ ویشیا کے پاس اُمراء آتے تھے۔ گوتم بدھ نے اپنا پہلا وعظ ایک ویشیا امبا پالی کے باغ میں کہا تھا اور اُس کے ہاں دعوت پر گیا تھا۔ راجے اور اُمراء گھروں میں کسبیاں رکھتے تھے۔ منوسمرتی میں راجہ کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ آرتی اتارنے، مالش اور مٹھی چاپی کرنے، ہار بنانے، لباس پہنانے اور خوشبو لگانے کے لئے خوبرو نوجوان کسبیاں محل میں رکھے۔ جب وہ بوڑھی ہو جائیں تو انہیں کھانا پکانے، کپڑے دھونے اور صفائی پر مامور کر دیا جائے۔

سندھ میں عام کسبی کو رنگیلی کہتے ہیں۔ کنیاری کی حیثیت اس سے بلند تر ہے کیوں کہ وہ گانے بجانے کا فن جانتی ہے۔ جنوبی ہند میں کسبیوں کو رام جنی کہتے ہیں۔ وجیانگر میں بے شمار کسبیاں دھندا کرتی تھیں۔ اُن سے جو محصول لیا جاتا تھا اُس سے پولیس والوں کو تنخواہیں دی جاتی تھیں[1]۔ البیرونی لکھتا ہے

[1] کتاب الہند

کہ عضد الدولہ دیلمی نے فارس میں کسبیوں پر محصول لگایا تھا۔ جلال الدین اکبر نے شیطان پورا کے نام سے شہر فتح پوری کے نواح میں کسبیوں کا چکلہ کھلوایا اور وہاں ایک داروغہ تعینات کیا جو ہر اُس شخص کا نام پتہ رجسٹر میں لکھ لیتا تھا جو کسی کسبی کے پاس رات بسر کرتا تھا۔ بادشاہ نے اپنے درباریوں کو حکم دیا کہ کوئی امیر کسی نوچی کا ازالۂ بکارت کرنا چاہے تو بادشاہ سے پیشگی اجازت لے نہیں تو اُسے سزا دی جائے گی۔ بادشاہ کے آدمی نوچیوں کے پاس جا کر اُن سے پوچھا کرتے تھے کہ تمہاری نتھلی کس نے اُتاری ہے۔ گول کنڈا میں پچیس ہزار کسبیاں تھیں جن کے نام داروغہ کے رجسٹر میں درج تھے۔ ان کے کوٹھوں کے قریب تاڑی بیچنے والوں کی دکانیں تھیں جہاں سے تاڑی پی کر لوگ کوٹھوں پر جاتے تھے۔ یہ کسبیاں اس قدر چاق و چوبند تھیں کہ ایک دفعہ نو کسبیوں نے مل کر ہاتھی کی شکل بنائی۔ چار پاؤں بنیں، چار نے جسم بنایا اور ایک سونڈ بن گئی۔ اس ہاتھی پر بیٹھ کر تاناشاہ سواری کیا کرتے تھے۔

اُمراء اپنے بیٹوں کو آداب محفل سکھانے کے لئے اعلیٰ طبقے کے ڈیروں پر بھیجا کرتے تھے۔ اس ضمن میں یونان کی ہیٹرا، جاپان کی گیشا، ہند کی دیشیا اور لکھنؤ کی ڈیرہ دار طوائف قابل ذکر ہیں۔ لکھنؤ کی کسبیاں تین ٹکڑیوں میں منقسم تھیں ــــ ۱) کنچنیاں ناچ گانے کی ماہر تھیں ــــ ۲) چُونا والیاں اُمراء کے ہاں نوکر رہتی تھیں ــــ ۳) ناگرنیاں جن میں ہر قوم کی کسبیاں شامل تھیں۔ دُنیا بھر میں کسبیوں کے چکلوں کو "سُرخ روشنی کا علاقہ" کہا جاتا ہے جو عام طور سے شہروں سے ہٹ کر ہوتا ہے۔ برصغیر میں کلکتہ کی سفید گلی اور لاہور کا شاہی محلہ خاصے بدنام ہیں۔

یورپ اور امریکہ کے ہر بڑے شہر میں قحبہ خانے موجود ہیں۔ کسبیوں کو عصمت فروشی کے لئے اجازت نامے لینا پڑتے ہیں اور ہفتے میں ایک بار طبی معائنہ کروانا پڑتا ہے۔ یورپ میں جرمنی کے شہر ہامبرگ کا چکلہ نہایت کشادہ اور منظم ہے۔ لندن، پیرس، نیویارک، شکاگو، ریوڈی جنیرو، سنگھاپور، ہانگ کانگ، قاہرہ،

بیروت وغیرہ میں بڑے بڑے قحبہ خانے موجود ہیں۔ اضلاع متحدہ امریکہ میں یہ کاروبار رسوائے زمانہ جرائم پیشہ تنظیم مافیہ کے ہاتھوں میں ہے۔ اُونچے درجے کی کسبیوں کو کال گرل، ہوسٹس، ماڈل گرل وغیرہ کہا جاتا ہے۔ ان کے اپنے سجے سجائے مکان ہوتے ہیں اور وہ ہر ماہ ہزاروں ڈالر کماتی ہیں۔ پہاڑی تفریح گاہوں میں عصمت فروشی کے اڈے کھول دیئے گئے ہیں جہاں تماش بینوں کو ہوائی جہاز میں بٹھا کر لے جاتے ہیں۔ مشرق میں ہانگ کانگ عصمت فروشی کا بہت بڑا گڑھ ہے۔ یہاں قحبہ خانوں کے صدر دروازے کے قریب دیواروں پر کسبیوں کی عکسی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ ہر تصویر کے نیچے کسبی کا قد و قامت، بالوں کا رنگ، عمر اور بدن کے زاویوں کے ناپ درج ہوتے ہیں۔ تماش بین جس تصویر پر ہاتھ رکھے اُسے بلا کر پیش کر دیا جاتا ہے۔ مغرب کے بڑے قحبہ خانوں میں شراب انتہائی گراں قیمت پر ملتی ہے گویا عصمت فروشی کو مہنگی شراب بیچنے کا وسیلہ بنا لیا گیا ہے۔ اس ضمن میں اضلاع متحدہ امریکہ کی ایک ریاست نیوادا دُنیا بھر میں بدنام ہے یوں لگتا ہے جیسے پوری ریاست قحبہ خانہ بن کر رہ گئی ہے۔ یہاں کے شراب خانوں اور جوئے خانوں میں برہنہ کسبیاں چاروں طرف چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں۔ نجی قحبہ خانے میں ہر کسبی کے ساتھ ایک غنڈا یا دلال ہوتا ہے جو اُسے تماش بینوں کی تعدّی سے بچاتا ہے۔ جنسی کجروؤں کے لئے الگ قحبہ خانے ہیں جہاں حیوانیت کے بدترین مظاہرے کئے جاتے ہیں۔ کسبیوں سے بید لگوانے کا بھاری معاوضہ وصول کیا جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ ادھیڑ عمر عیاش عورتیں نوجوان "مرد کاسبوں" کو نوکر رکھ لیتی ہیں جنہیں ژگالو کہتے ہیں۔ سدومی ذوق کی پرورش کے لئے الگ قحبہ خانے ہوتے ہیں۔ اشتراکی معاشرے میں البتہ عصمت فروشی کا کامل انسداد کر دیا گیا ہے اور عصمت فروشی اور دلالی سنگین جرائم میں شمار ہوتے ہیں جن کی عبرت ناک سزا دی جاتی ہے۔

سادھو، سنت، فقیر

معاشرۂ انسانی میں شروع سے کچھ ایسے لوگ موجود رہے ہیں جو ہر قسم کی مذہبی، سماجی اور اخلاقی حدود و قیود سے آزاد زندگی گذارتے رہے ہیں۔ انہیں تارک، جتی یا مجرّد کہا جاتا ہے۔ ان میں سادھو، سنیاسی، جوگی، راہب، ملنگ، فقیر، قلندر شامل ہیں مسلمانوں میں ملامتیہ کا بے شرع اور بے قید فرقہ ہے جس کے افراد اعلانیہ شراب پیتے ہیں، افیون کھاتے ہیں، بھنگ سے شغل کرتے ہیں، چرس اور گانجے کے نشے کرتے ہیں اور گاتے بجاتے ہیں۔ شاہ حسین لاہوری اور سعید ائے سرمد فرقہ ملامتیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ شاہ حسین شراب کے نشے میں دھت گلی کوچوں میں ناچتا پھرتا تھا اور سعیدائے سرمد مادر زاد برہنہ رہتا تھا۔ بالناتھ کے پیرو جوگی کان پھڑوا کر مُندرے پہنتے تھے، سر کے بالوں کا صفایا کراتے، بھنگ پیتے تھے، کھپری (لغوی معنی کھوپڑی) میں کھاتے پیتے تھے اور در بدر ناد پھونک کر بھیک مانگتے تھے۔ وارث شاہ نے رانجھے کے حوالے سے ہیر میں ان کا اُستادانہ نقشہ کھینچا ہے۔ یہ لوگ کرامات دکھانے کے مدعّی تھے مثلاً کہتے تھے کہ ہم منہ میں ایک گولی گٹکا پارہ رکھ کر ہوا میں اُڑ سکتے ہیں۔ آنکھوں میں طلسماتی انجن لگا کر لوگوں کی نظروں سے غائب ہو جاتے ہیں۔ شیومت کا ایک فرقہ کپالک کہلاتا تھا جو کھوپڑی میں کھاتا پیتا تھا۔ سادھو بدن پر بھبوت ملتے ہیں اُس کی راکھ کی یاد میں جو اُن کی مرگھٹ میں جلنے سے بنے گی۔ یہ گویا موت کو یاد رکھنے کا ایک طریقہ ہے۔ کئی سادھو عمر بھر ایک ہی جگہ کھڑے رہتے ہیں، انہیں کھڑے سرے کہتے ہیں۔ ننگے سادھو برسرِ عام مادر زاد برہنہ گھومتے پھرتے ہیں۔

عیسائیوں میں ولی فرانسس کے پیرو مادر پدر آزاد زندگی گذارتے تھے۔ وہ پیروں میں

بیڑیاں اور ہاتھوں میں کڑیاں پہنتے تھے جس سے جناب عیسیٰ کے قید و بند کے مصائب کو یاد کرنا مقصود تھا۔ رہبانیت کا آغاز قسطنطائن کے عہد میں مصر سے ہوا جہاں کے راہب پوکومیوس کو دُنیائے عیسائیت کا پہلا راہب کہا جاتا ہے۔ راہب ترکِ دنیا کر بھٹوں اور کھوہوں میں رہتے تھے۔ عالمِ تجرّد میں ان پر نفسانی خواہشات کا غلبہ ہوتا تو اپنی پیٹھ پر خار دار کوڑے برسا کر اپنے آپ کو لہولہان کر لیتے تھے۔ خانقاہی رہبانیت کے اکابر میں وِلی انتھنی (۳۵۶ء) اُس کا شاگرد پلاریون (غزّہ) افراہیم (شام) اور سمیون مشہور ہوئے۔ سمیون تیس برس تک ساٹھ فٹ اُونچے ایک منارے پر مقیم رہا۔ اُس نے رسّے سے اپنے آپ کو منارے کے کنگرہ ل سے باندھے رکھا۔ اِسی عالم میں وہ دھوپ کی کڑیاں اور جاڑے کی سختیاں جھیلتا رہا۔

ایران کے بے نوا درویش حد درجے لاابالی ہوتے ہیں اور چار چیزوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ (۱) تبر (کلہاڑا) (۲) کشکول (۳) تاج (اُونی ٹوپی) اور (۴) گیسو (لمبے بال)۔ مصرِ جدید کے سعدیہ فقیر آگ نگل جاتے ہیں، شیشہ چبا کر کھا جاتے ہیں اور سانپ بچھو ان کی خوراک ہیں۔ اُن کا شیخ آئے تو سب اوندھے مُنہ اُس کے راستے میں لیٹ جاتے ہیں اور وہ گھوڑے پر سوار اُن کے جسموں پر سے گذر جاتا ہے۔ اِس رسم کو دوسہ کہتے ہیں۔ برِّصغیر ہند و پاک میں ملنگوں کے کئی فرقے ہیں جو اپنے مخصوص طور طریقوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ الف شاہی ملنگ اپنے ماتھے پر الف کا نشان بناتے ہیں، موسیٰ سہاگ کے پیرو ناک میں نتھلی ڈالتے ہیں اور زنانہ لباس پہنتے ہیں، مداریہ شاہ بدیع الدین مدار کے ملنگ ہیں جو دھمال کودتے ہیں یعنی انگاروں پر چلتے ہیں اور دَم دَم مدار کا نعرہ مارتے ہیں، گرز مار ملنگ کاندھے پر گرز اٹھائے اٹھائے پھرتے ہیں، کسی سے بگڑ جائیں تو یہی گرز دے مارتے ہیں، مُنہ چیرے یا مُنہ پھوڑے ملنگ اپنے چہرے زخمی کر کے بگاڑ لیتے ہیں، دوسرے ملنگوں اور فقیروں کی طرح نماز روزے کے تارک ہوتے ہیں اور بھنگ پیتے ہیں۔ لال شہباز کے قلندر خُدا کو خاوند کہتے ہیں اور اپنے آپ کو اُس کی سُہاگن سمجھ کر کلائیوں میں چوڑیاں، ناک میں

تھ پہنتے ہیں اور رنگ برنگ کے زنانہ لباس پہنے پھرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے عجیب و غریب نام رکھ لیتے ہیں مثلاً لکڑ شاہ، خاکی شاہ، ہاتھ کٹوری والا، مشکی شاہ، چشتی شاہ، بھاڑ شاہ وغیرہ۔ ان کے ہاتھ میں بھنگ گھوٹنا ہوتا ہے جسے پنجابی میں مُتہر کہتے ہیں۔ اس کے سرے پر گھنگرو جڑے ہوتے ہیں جو بھنگ گھوٹتے وقت ایک تال میں بج اُٹھتے ہیں۔ ان کے ساتھ کچھ مشتبہ کردار کی عورتیں ہوتی ہیں جنہیں ملنگیاں کہتے ہیں۔ یہ عورتیں سبز جامے میں دکھائی دیتی ہیں اور ایک بڑی سی مالا جپتی رہتی ہیں۔ جلالیہ سید جلال بخاری (اُچ شریف والے) کے ملنگ ہیں جو چہار ابرو کا صفایا کراتے ہیں۔ اُن کا خاص لباس ہوتا ہے :- (۱) تاج (پشمینے کی ٹوپی) :- (۲) الفی (سیاہ اُون کا جبّہ بغیر آستین کے۔ اِس میں سفید اُون کا تانا ہوتا ہے) :- (۳) گودڑی :- (۴) عصا :- (۵) بیراگن (صلیب نما لکڑی ہوتی ہے جس پر مراقبے کے وقت سر رکھتے ہیں) :- (۶) گانی، سیاہ اُون کا بٹا ہوا دھاگا جس میں سُرخ ریشمی تار کی بنوٹ ہوتی ہے۔
:- (۷) سیاہ اُون کا دھاگا جو کمر میں باندھتے ہیں :- (۸) کاسۂ گدائی یا ٹھیکری جس میں بھیک ڈالتے ہیں۔
:- (۹) تومبی : کدو کا پیالہ جس میں پانی پیتے ہیں :- (۱۰) ناد : مارخور کا سینگ جو بھیک مانگتے وقت لوگوں کے دروازے پر پھونکتے ہیں۔ جلالی فقیر کا کندھا تپائے ہوئے لوہے سے داغ دیا جاتا ہے اور مُرشد اُسے دربدر بھیک مانگنے کا حکم دیتا ہے۔ مرشد بھیک کا ایک تہائی حصّہ وصول کرتا ہے۔

ملنگوں اور فقیروں کے تکیے پہلے پہل مصر میں قائم کئے گئے۔ اس کے بعد شام، لبنان، اور فلسطین میں جا بجا تکیے دکھائی دینے لگے جو زمانے کے گذرنے کے ساتھ منشیات کے استعمال کے اڈے بن گئے۔

پنجاب کے نوشاھیہ نہا دھو کر اچھا لباس پہن کر مجلس میں آتے ہیں جہاں عورتیں بھی موجود ہوتی ہیں پہلے سر مار کر حال کھیلتے ہیں پھر انہیں رسّی سے باندھ کر کسی درخت سے لٹکا دیتے ہیں سر

نیچے پاؤں اوپر لٹکے ہوئے دیوانہ وار ٹانگیں چلاتے ہیں، سر ہلاتے ہیں اور نعرے مارتے ہیں۔ یہ منظر بڑا دلچسپ ہوتا ہے۔

عیسائی راہبوں اور راہبات کو ایک بات دوسرے بے شرع و بے قید لوگوں سے ممتاز کرتی تھی۔ وہ عمر بھر غسل نہیں کرتے تھے کہ ان کے خیال میں بدن کی صفائی سے نفسانی خواہشات غلبہ پالیتی ہیں۔ وہ جوؤں کو "خدا کے موتی" کہا کرتے تھے۔

چندر امل کے پیرو ستھرے کہلاتے تھے۔ وہ ڈنڈے بجا بجا کر بانیاں پڑھتے اور بھیک مانگتے تھے۔ رنجیت سنگھ نے فی دکان ایک پیسہ ماہوار اور بیاہ کا ایک روپیہ مقرر کر دیا تھا۔ ان کا مسلک صُلح کُل تھا۔ ہندو مسلمان دونوں انہیں اچھا جانتے تھے۔ ان کا چیلا بنانے کی رسم یوں تھی کہ گورو امیدوار کو سورج کے سامنے کھڑا کر کے یہ شبد پڑھتا تھا "چندر سورج نے ساکھی دینی، بر ہمالش مہاویر نے مان لیتی۔" وہ اخلاق اور شائستگی سے آزاد تھے اور ہر قسم کی بے راہ روی کے شکار ہو گئے تھے۔

طِب

انسان کے دورِ وحشت میں مرض اور موت کو کسی نہ کسی بد رُوح کی کار فرمائی سمجھا جاتا تھا۔ کئی اقوام اور قبائل میں آج بھی وہم پرست لوگوں کا یہی عقیدہ ہے۔ بیمار پڑنے پر کسی ڈاکٹر سے رجوع لانے کے بجائے عامل یا سیانے کو بُلاتے ہیں جو مرض کو رفع کرنے کے لئے جھاڑ پھونک کرتا ہے یا الائچی اور لونگ پر دَم کر کے مریض کو کھلانے کی ہدایت کرتا ہے۔ مصرِ قدیم میں طب کا ارتقاء ہوا جب اسے جادو سے جدا کرنے کی ابتدائی کوششیں کی گئیں۔ وہاں بھی ایک مدت تک طب جادو بالمثل کی اصولوں پر نشوونما پاتی رہی مثلاً بادام کی شکل آنکھ کی ہوتی ہے اس لئے اس کا کھانا مقوّی بصر ہے، اخروٹ مغز سر کی شکل کا ہوتا ہے اس لئے مقوّی دماغ ہے، پیاز کی صورت خُصیتین سے ملتی جلتی ہے اس لئے مقوّی باہ ہے، سیب دِل کے مشابہ ہے اس لئے مقوّی قلب ہے۔ مصر میں بیل اور بکرا غیر معمولی جنسی طاقت کے مالک سمجھے جاتے تھے اس لئے طبیب کمزور مرد کے لئے ان کے خُصیتین کھانے کے لئے تجویز کرتے تھے۔ مصریوں کے بارے میں قدماء کہا کرتے تھے کہ ان کی صحت نہایت عمدہ ہوتی ہے اور اس کا سبب یہ تبلاتے تھے کہ مصری مہینے میں ایک بار حقنہ کرتے تھے یا جلاب لیا کرتے تھے۔

مصری طبی روایات یونانی اطباء کے واسطے سے عربوں کی طب میں بھی بار پاگئیں اور آج بھی باقی ہیں۔ ہمارے "یونانی اطباء" بھی تقویتِ باہ کے لئے مردوں کو بکرے کے خُصیتین کھانے کا مشورہ دیتے ہیں، بیرونی استعمال کے لئے مقوّی ضماد میں بولِ خر ملا کر رگڑا جاتا ہے کیوں کہ گدھا بھی غیر معمولی قوتِ باہ

کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ طب کی طرح کیمیاگری کا آغاز بھی مصرِ قدیم ہی سے ہوا تھا۔ کیمیا مصرِ قدیم ہی کا پرانا نام تھا۔ طب اور کیمیاگری کا چولی دامن کا ساتھ سمجھا جاتا تھا کئی ذہین لوگ تانبے جیسی معمولی دھاتوں کو سونے میں تبدیل کرنے کی کوشش میں اپنا مال و متاع اور عمرِ عزیز گنوا بیٹھے۔ ہندوستان میں کیمیاگری کو رسائن کا نام دیا گیا یعنی رس (سونا) بنانے کا علم۔ سونا بنانے کے سلسلے میں جو تجربات کئے گئے اُن سے کشتہ سازی کے فن کو ترقی ہوئی۔ سم الفار، شنگرف، ہڑتال، پارے وغیرہ دھاتوں کو جڑی بوٹیوں کے پانی میں رگڑ کر کٹوری میں رکھتے اور پھر اُسے سمپٹ (گل حکمت) کرکے پانچ دشتی کی آگ میں رکھ دیتے ہیں جس سے دھات کا کشتہ بن جاتا ہے۔ ان کشتوں کو علاجِ امراض اور خاص طور سے اعادۂ شباب (کایاکلپ) کے لئے استعمال کرایا جاتا ہے۔ آیور ویدک اور طبِ یونانی دونوں میں کشتے کھلائے جاتے ہیں۔

یونان اور روما قدیم میں ہیپوکریٹیس (بقراط) الکمین (لقمان) اور گیلینس (جالینوس) نے طب کو باقاعدہ ایک سائنس بنانے کی کوشش کی۔ بقراط نے چار مزاجوں کا مشہور نظریہ پیش کیا۔ اُس کا ادعا یہ تھا کہ ان مزاجوں کا خیال رکھے بغیر کسی مرض کا علاج ممکن نہیں ہو سکتا۔ بلغمی، سوداوی، دموی اور صفراوی۔ مزاجوں کے اس نظریے کی حال ہی میں مشہور روسی عالم پاولوف نے تصدیق کی ہے اور تجربات سے اسے ثابت کیا ہے۔ چنانچہ اب اس نظریے کو مسلمات علمی کا درجہ حاصل ہو گیا ہے اور علمائے نفسیات بھی اس حوالے سے تحقیق کر رہے ہیں۔ جالینوس نے تاریخِ طب میں تشریح الاعضا کے لئے انسانی مُردوں کی چیر پھاڑ کی طرف توجہ دلائی۔ جب حکومتِ وقت نے اُسے انسانی مُردوں پر تجربات کرنے سے منع کر دیا تو وہ حیوانوں پر تجربات کرنے لگا جس سے علمِ جراحی کو فروغ حاصل ہوا۔

بنو عباس کے دورِ حکومت میں دوسرے علوم کے ساتھ یونانی، سریانی اور سنسکرت سے طب اور جراحی کی کتابیں ترجمہ کی گئیں۔ ترجموں میں بخت یشوع، اُس کا بیٹا جبریل، یوحنا بن ماسویہ اور ثابت بن قرہ صابی قابلِ ذکر ہیں۔ ترجمہ کے ساتھ طبع زاد کتابیں بھی تالیف کی گئیں اور ایک مستقل علمِ طب

کی بنیاد رکھی گئی جسے بعد میں اِسلامی طب یا یُونانی طِب کے نام دیئے گئے۔ مسلمان اطباء میں زکریا الرازی، بُوعلی سینا، زَہراوی اور ابن بیطار کے نام آج بھی احترام سے لئے جاتے ہیں۔ ابن بیطار کی جڑی بوٹیوں پر تحقیق نہایت قابلِ قدر ہے۔ ان اطباء کی کتابیں صدیوں تک مغربی ممالک کے نصاب تعلیم میں شامل رہیں۔ بندھے منکہ، بہلا اور فلبرفل جیسے معالج بنو عباس کے دربار میں باریاب ہوئے اور آیورویدک اور طب یُونانی کا امتزاج عمل میں آیا۔ میڈیکل سائنس کی ترقی کے ساتھ یُونانی طب زوال پذیر ہو گئی کیوں کہ اطباء مشاہدے اور تجربے سے دست کش ہو گئے اور علم تشریح الابدان کو پسِ پُشت ڈال دیا۔ آج کل یُونانی اطباء کی تحقیقات کا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ قرابادین اور رموزِ اعظم جیسی پُرانی کتابوں سے نسخے اخذ کر کے انہیں نئے نئے پُرکشش نام دیئے جائیں اور پُرانی شراب کو نئی بوتلوں میں بند کر کے سادہ لوح عوام سے پیسے بٹورے جائیں۔ ہمارے "زبدۃ الحکماء" اور "مسیحِ زمانہ" قسم کے طبیبوں کے پاس ایک صندوقچہ خاص ہوتا ہے جس میں مُقوّی، مُبہی اور مُمسک دوائیں رکھی جاتی ہیں اور گراں قیمت پر عیش پسند اُمراء اور روساء کے ہاتھ بیچی جاتی ہیں۔ ان کے "تیر بہدف" ہونے کے اشتہار بڑی ترغیب آور زبان میں دیئے جاتے ہیں۔ اطباء کے اشتہاروں سے شُبہ ہوتا ہے کہ مردانہ کمزوری کا مرض وبا کی صورت میں مُلک بھر میں پھیل گیا ہے اور یہ مردانہ کمزوری "خاندانی حکماء" کے لیے سونے کی کان بن گئی ہے۔

جسمانی عوارض کے ساتھ ساتھ ذہنی و نفسیاتی امراض کی تشخیص اور علاج کی روایت بھی یُونانِ قدیم سے شروع ہوئی تھی۔ افلاطون اور ارسطو نے وسواسی امراض کا ذکر کیا ہے۔ بُوعلی سینا عشق کو بھی مالیخولیا ہی کی ایک صورت سمجھتا ہے اور اس ضمن میں اُس کی تشخیص اور علاج خاصے دلچسپ ہیں۔

حمّام

حمّام میں نہانے کا رواج مشرقِ وسطیٰ کے ملکوں میں قدیم زمانے سے موجود رہا ہے۔ رومۃ الکبریٰ میں حمّام باقاعدہ ایک ادارہ بن گیا تھا جہاں لوگ فارغ اوقات میں غسل کرنے کے بہانے بیٹھتے، خوش گپیاں کرتے اور نہانے کے ساتھ ساتھ خشک میوے ٹھونگتے اور شراب کی چسکیاں لیا کرتے۔ حمّام میں سرد اور گرم پانی دھات کی نالیوں سے لایا جاتا تھا۔ مٹھی چاپی اور مالش کے لئے غلام حاضر رہتے۔ اطباء گنٹھیا کے مریضوں کے لیے حمّام تجویز کرتے تھے خیال یہ تھا کہ گرم پانی کی بھاپ سے جسم سے فاسد مادوں کا اخراج ہو جاتا ہے اور جوڑ بند کھل جاتے ہیں۔ عیسائیت کی اشاعت کے بعد رہبانیت کا نفوذ ہوا تو لوگ نہانے سے گریز کرنے لگے۔ عیسائی اولیاء غسل کرنے اور کپڑے بدلنے سے گریز کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ بدن کو صاف رکھنے، بالوں میں کنگھی کرنے اور خوشبو لگانے سے شیطان غلبہ پا لیتا ہے اور نفسانی خواہشات بھڑک اٹھتی ہیں۔ عورتوں کے لئے نہانا سخت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ باقاعدگی سے غسل کرنے والی عورت کو آوارہ اور بد چلن سمجھتے تھے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے لئے نہانا اور صاف ستھرا رہنا جزوِ ایمان ہے چنانچہ اسلامی ممالک ترکیہ، ایران، شام، عراق، مصر، ٹیونس اور اندلس وغیرہ میں سیکڑوں حمّام تھے جہاں لوگ ہفتے میں کم از کم ایک بار جاتے تھے۔ حمّام کوئی چھوٹا سا بدبودار غسل خانہ نہیں ہوتا تھا جیسا کہ ہمارے ہاں نائیوں نے بنوا رکھا ہے بلکہ ایک کشادہ عمارت ہوتی تھی جو کئی کمروں پر مشتمل ہوتی تھی، درمیان میں عموماً گنبد تعمیر کرایا جاتا تھا۔ اس میں لباس بدلنے اور نشست و برخاست کے کمرے الگ ہوتے تھے۔ مختلف کمروں میں گرم اور سرد پانی مہیا کیا جاتا تھا۔ فرش اور دیواریں عموماً سنگ مرمر کی بنائی جاتی تھیں۔ ایران میں دیواروں پہ

سنگ ابری لگوایا جاتا تھا۔ ایرانی ابتدائے تاریخ سے بہتے ہوئے پانی کے شیدائی رہے ہیں۔ آج بھی اچھے گھروں کے صحنوں میں چھوٹی سی ندی بہتی ہے جس کے کناروں پر رنگ برنگ کے پھول اُگائے جاتے ہیں۔ فوارے اُچھلتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی آسائش حماموں میں بھی ملتی تھی۔ بڑے بڑے حمام سیرگاہیں بن گئے تھے جہاں لوگ فراغت کا وقت گذارنے چلے جاتے تھے۔ موسموں کے لحاظ سے گرم یا سرد مشروب فراہم کئے جاتے تھے۔ غسل کے کمرے میں داخل ہوتے ہی حمامی خدمت گار آجاتا۔ آنے والا لباس اُتار کر ایک لنگ کمر سے باندھ لیتا جیسا کہ گلستان سعدی سے معلوم ہوتا ہے خوبرو اور خوش گِل لڑکے خدمت کے لئے حاضر رہتے تھے۔ شیخ سعدی بھی ایک حسین حمامی لڑکے کو گھورنے کے لئے کئی میل پیدل چل کر اُس کے حمام میں گئے تھے۔ حمامی آنے والے کے بدن کو زرد رنگ کی خاص خوشبودار مٹی گِل سر شوئے سے رگڑ کر صاف کرتے تھے۔ نائی خط بنانے کے لئے موجود ہوتے۔ پہلے گرم پانی سے غسل کرتے پھر نیم گرم پانی سے اور آخر میں خُنک پانی سے نہاتے تھے۔ جب آدمی حمام کر کے باہر نکلتا تو وہ ہلکا پھلکا محسوس کرتا تھا۔

عورتوں کے حمام الگ تھے جہاں کنیزیں غسل میں مدد دیتی تھیں اور حجر الحمام (بدن پر سے میل رگڑ کر صاف کرنے والے پتھر، ہمارے ہاں کا جھانواں) سے پاؤں صاف کرتی تھیں۔ قدیم روما کے حماموں میں کئی کئی مرد مادر زاد برہنہ ایک دوسرے کے سامنے غسل کرتے تھے۔ کسانووا اپنی خود نوشت سوانح حیات میں لکھتا ہے کہ جب وہ ماسکو کے ایک حمام میں نہانے کے لئے گیا تو دیکھتا کیا ہے کہ وہاں چالیس پچاس عورتیں مرد اکٹھے نہا رہے تھے جاپانی عورتیں مرد بھی ایک دوسرے کے سامنے بلا تکلف نہاتے ہیں اور اس میں قطعی کوئی باک محسوس نہیں کرتے۔ ہندوستان میں مسلم سلاطین نے بھی حمام بنوائے تھے لیکن عوام نے ان میں کوئی دلچسپی نہ لی کیوں کہ نہانے کے لئے پانی کی فراوانی تھی۔ علاج امراض کے لئے البتہ لوگ حماموں میں جاتے تھے۔ جلال الدین اکبر کے زمانے کا بنوایا ہوا ایک حمام آج تک گجرات کے ڈھکی دروازے کے نیچے موجود ہے جس میں مریض غسل کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ اس کے قریب ایک باؤلی بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ یہ حمام اور باؤلی شاہی قلعے کی تعمیر کے ساتھ ہی بنوائے گئے تھے۔

ٹے بُو

ٹے بُو کا لفظ ایک لال ہندی قبیلے کی بولی سے لیا گیا ہے جس کا معنیٰ ہے مُقدّس اور ممنوع مثلاً مصرِ قدیم اور یُونان میں خنزیر کو مُقدّس سمجھتے تھے اِس لئے اُس کا گوشت کھانا ممنوع تھا۔ زمانے کے گُذرنے کے ساتھ ٹے بُو رسموں کی صورت اختیار کر گئے جو شُدہ شُدہ اخلاق اور قانون کی اساس بن گئیں چند معروف ٹے بُو درج ذیل ہیں۔

افریقہ کے بعض جنگلی قبائل میں کسی کنواری جوان لڑکی کا دھُوپ میں بیٹھ کر نہانا منع ہے مُبادا سُورج اپنی کرنوں سے اُسے حاملہ کر دے۔ قدیم مصر میں مُردے کو اُونی کفن پہنانا ممنوع تھا۔ فیثا غورس کے پیروؤں کو لوبیا اور سفید مُرغے کا گوشت کھانے سے منع کر دیا گیا تھا۔ وہ رات کو آئینہ بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ گرہن کے اوقات میں مغربی عورتیں مُربّے اور چٹنیاں اچار نہیں ڈالتی تھیں نہ کیک بناتی تھیں۔ ہندوستان میں گرہن کے دوران میں حاملہ عورت اور اُس کا شوہر ناریل نہیں چھوڑتے نہ کوئی سبزی یا پھل چھُری سے کاٹتے ہیں۔ بعض ممالک میں حاملہ عورت گرہن کے دن زینے کے نیچے بیٹھے بغیر نہا نہیں سکتی تھی۔ مجوسیوں کے یہاں عناصرِ اربعہ؛ ہوا، مٹی، پانی، آگ کو آلودہ کرنا منع ہے، بہتے پانی میں گندگی پھینکنا، مٹی میں مُردے دفن کرنا یا آگ میں جلانے پر قدغن ہے۔ ہمارے یہاں حائضہ کے لئے نَومولود بچے اور زچّہ کے سامنے جانا منع ہے۔ افریقی قبائل میں لیٹے ہوئے آدمی کی ٹانگیں پھلانگ کر گُذرنا ممنوع ہے۔ یہودیوں اور مسلمانوں میں مقاربت کے بعد غُسل جنابت کئے بغیر کھانا پینا یا عبادت کرنا منع ہے۔ مسلمانوں کے لئے کعبے یا قطب تارے کی جانب

پیر پسار کر لیٹنا ممنوع ہے۔ کسی زمانے میں کسی دوسرے کے سامنے کھانا پینا منع تھا۔ آج بھی دیہاتی عورتیں مردوں کے سامنے بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتیں۔ موم بتی یا چراغ کو پھونک مار کر بجھانا ہندوؤں اور مجوسیوں کے ہاں معیوب ہے۔ یہودیوں کے ہاں سبت (سنیچر) کے دن کام کرنا منع ہے۔ ہندو چاند کی ۱۲ ویں کو سفر نہیں کرتے۔ مغرب میں ۱۳ نمبر کی نشست پر نہیں بیٹھتے۔ برہمن کے لئے گوشت یا انڈہ کھانا ممنوع ہے نیز اُس کے لئے کُتّے اور مسخرے کے سامنے کھانا پینا منع ہے سنیاسی اور بیوہ کے لئے رات کا کھانا ممنوع ہے۔ ہندو عورت کے لئے نیلے رنگ کا لباس پہن کر چوکے میں جانا اور کھانا پکانا منع ہے۔ سکھوں کے لئے ٹوپی پہننا یا سر اور ڈاڑھی کے سفید بالوں میں خضاب لگانا ممنوع ہے۔ ہندو بیوہ کا ہار سنگھار کرنا چوڑیاں پہننا، خوشبو لگانا اور آئینہ دیکھنا منع ہے۔ اسی طرح برہم چاری کے لئے پان کھانا، ماتھے پر چندن کا ٹیکا لگانا اور آئینہ دیکھنا ممنوع ہے۔ جاپانی شہنشاہ کے لئے ایک ہی برتن میں دوسری بار کھانا پینا اور ایک ہی لباس دوبارہ پہننا منع ہے۔ کوئی شخص کسی نشست پر اپنا رومال یا چھڑی رکھ جائے تو وہاں کسی دوسرے کا بیٹھنا ممنوع ہے۔ ہمارے ہاں گویوں کا بے وقت کی راگنی گانا منع ہے مثلاً وہ رات کو آسا اور دن کو مالکوس نہیں گاتے۔ شرفاء کے ہاں بر سرِ محفل جنس کے موضوع پر واشگاف انداز میں باتیں کرنا منع ہے۔ بھری محفل میں کسی شخص کی طرف پیر پسار کر بیٹھنا ممنوع ہے۔ عربوں میں قہقہہ لگا کر ہنسنا منع ہے۔ ہندو عورت کے لئے اپنے پتی کا نام لینا ممنوع ہے۔ کالی بلّی راستہ کاٹ جائے تو سفر کرنا ممنوع ہے۔ عربوں کے یہاں کسی میزبان کے بچے کی خوبصورتی کی تعریف کرنا منع ہے۔ معاشرتی پہلو سے ٹبُو کا آغاز محرّمات کے ساتھ خلوت میں جانے کی ممانعت سے ہوا تھا۔ فرائڈ کے خیال میں اسی ٹبُو سے انسانی اخلاق کا آغاز ہوا تھا۔

مندرجہ بالا ٹبُو میں اکثر کے مآخذ ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو چکے ہیں لیکن رسموں کی صورت میں اقوامِ عالم میں باقی و برقرار ہیں۔

ضمیمہ

چراغی ——— ہر جمعہ کو لڑکے اپنے اُستاد کے لئے کچھ رقم لاتے تھے جسے چراغی کہا جاتا تھا۔ کسی ولی کے مزار پر چراغ جلانے کے لئے مجاور کو جو رقم دی جائے اُسے بھی چراغی کہتے ہیں۔ جوئے خانے کا مالک دوسرے جواریوں سے چراغی کے نام پر کچھ رقم وصول کیا کرتا تھا۔

قُلی عورتیں ——— نیپال میں قُلی عورتیں تاجروں اور اُن کے سامان تجارت کو کندھوں پر لاد کر اُونچی پہاڑی بستیوں کو لے جاتی تھیں۔ دو عورتیں مل کر اپنے کندھوں پر چوکی بنا لیتی تھیں جس پر تاجر کو بٹھا لیا جاتا تھا۔

جے نارائن ——— ہندو چھینک مارے تو کہتا ہے "جے نارائن" مسلمان کو چھینک آئے تو کہے گا "یرحمک اللہ"۔

دِکشا ——— گورو دِکشا سے چیلا بناتا ہے جیسے مسلمان کا پیر مرید سے بیعت لیتا ہے۔

ایک نسخہ ——— بواسیر کا علاج کرانے کے لئے پنجاب میں سیاہ، سُرخ، سبز، زرد رنگ کے دھاگے بٹ کر پاؤں کے انگوٹھے سے باندھتے ہیں۔

تحفہ ——— ایرانی دیہات میں گذرتے وقت مُسافر کو پھولوں کا گلدستہ بطور تحفہ دیا جاتا ہے۔ سوغات یا راہ آورد وہ تحفہ ہے جو مسافر اپنے عزیزوں کے لئے لاتے ہیں۔ پیش کش وہ تحفہ جو اپنے ہم رُتبہ کو دیا جاتا ہے۔ جو تحفہ اپنے سے کم مرتبہ والے کو دیا جائے وہ انعام کہلاتا ہے۔

پیر ملاؤ ——— امام ضامن کو کہتے ہیں جس کے نام پر کچھ رقم مسافر کے بازو سے باندھی جاتی ہے۔

دو سُرخ چیزیں ——— جو عورتوں کو گمراہ کرتی ہیں، سونا اور زعفران (خوشبو)، دو سُرخ چیزیں جو مرد کو ورغلا لیتی ہیں:

گوشت اور شراب۔

V فاروکرٹی ـــــ ایک قدیم علامت ہے۔ قدیم مصر میں سورج دیوتا ہورس اپنی انگشت شہادت اور درمیانی انگلی سے V کا نشان بنایا کرتا تھا تاکہ شیطان ٹائی فون بھاگ جائے۔

تاج ـــــ اولمپک کھیلوں میں یونانی جیتنے والے کو لارل کی ٹہنیوں کا تاج پہناتے تھے جو اُن کا سب سے بڑا اعزاز تھا۔

اعزاز ـــــ روما میں جو شخص اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر کسی کی جان بچاتا تھا اُسے شاہ بلوط کے پتوں کا تاج پہنایا کرتے تھے۔

پٹھان ـــــ شکست کھا کر فاتح کے روبرو آتے تو مُنہ میں گھاس لے کر آتے تھے۔

قسم ـــــ عرب اپنی ڈاڑھی کی قسم کھاتے ہیں۔

خطرہ ـــــ جس آدمی سے کسی قسم کا خطرہ ہو پنجاب میں عورتیں اس کی پیٹھ پیچھے کالی ہنڈیا توڑتی ہیں۔

نیا مکان ـــــ نئے مکان کو نظرِ بد سے بچانے کے لئے اُس کی چھت کی منڈیر پر کالی ہنڈیا رکھتے ہیں۔

سزا ـــــ ایران قدیم میں اِسقاط کی سزا موت تھی۔

دھاریں ـــــ سفر پر یا جنگ پر جانے سے پہلے پنجابی نوجوان اپنی ماں سے بتیس دودھ کی دھاریں بخشوا کر جاتے ہیں۔

موت ـــــ جب کوئی عباسی خلیفہ مر جاتا تو درباری سروں سے عمامے اُتار کر زمین پر پھینک دیتے تھے۔

یاسا ـــــ چنگیز خاں کے ضابطۂ قوانین یاسا میں بھی زنا، اِغلام، جھوٹ اور جادوگری کی سزا موت تھی۔

نمک ـــــ پرانے وقتوں میں نمک نایاب اور گراں قیمت تھا۔ روما میں بعض اوقات سپاہیوں کو تنخواہ میں نمک دیا کرتے تھے۔

مالحین ـــــ جنہوں نے ایک دوسرے کا نمک کھایا ہو مراد ہے دلی دوست۔

مُقدّس کتابیں ـــــ یہودیوں اور مسلمانوں کی مُقدّس کتابیں اتفاقاً زمین پر گر جائیں تو انہیں اُٹھا کر چُومتے ہیں۔

کلمۂ انگلیز ـــــ قاہرہ میں دکاندار اور خریدار میں کسی شے کی قیمت پر تکرار ہو جائے اور دکاندار کو کہنا ہو کہ بس اس سے کم نہیں دوں گا تو وہ کہتا ہے یہ کلمۂ انگلیز ہے یعنی انگریز کا قول جو آخری اور قطعی ہوتا ہے۔

جنسی ملاپ ـــــ اودریسی لکھتا ہے کہ راجہ بلہرا کے ملک میں بیاہتا عورت کے سوا سب عورتوں سے جنسی ملاپ کرنا جائز ہے۔

جیلوی ـــــ پٹھان جو عجیب و غریب لباس پہنتے ہیں اور مرنے مارنے کو تیار رہتے ہیں جیسے لکھنؤ کے بانکے اور پنجاب کے غنڈے۔

ہزل ـــــ فحش کلام۔ محمد شاہ رنگیلے کے دربار میں ہزل گو شاعروں کا کلام بہت پسند کیا جاتا تھا۔

رُومی عورت ـــــ تین بیٹوں کی ماں بن کر اپنے شوہر کے تسلّط سے آزاد ہو جاتی تھی۔

سُرخ پھول ـــــ افریقہ کے ایک حبشی قبیلے کی عورتوں پر جنسی خواہش کا غلبہ ہو تو وہ اپنے بالوں میں سُرخ پھول لگا کر مردوں کے سامنے آتی ہیں۔

مالا ـــــ بودھوں کی ایجاد ہے۔ اُن سے شامیوں نے لی پھر عیسائیوں اور مسلمانوں میں رواج پا گئی۔

جُتی ـــــ ہندو مُجرّد چالیس چالیس دن کا برت رکھتے تھے۔

شُبھ دن ـــــ جمعہ، سوموار، بدھ وار اور جمعرات مبارک دن ہیں۔ سنیچر مُقدّس ہے۔ جمعرات کو لگنے والا والا مرض کسی پری کے سائے کا نتیجہ ہوتا ہے۔

پختون ولی ـــــ پٹھانوں کا ضابطۂ اخلاق ـ(۱) بدل (انتقام) ـ(۲) میل مستیا (خاطر تواضع) ـ(۳) ننواتے پناہ۔

محصول ـــــ کالی گولا نے رومہ کی ہر کسبی پر اُس کی خلوت کی کمائی کا محصول لگایا جو ہر روز وصول کیا جاتا تھا۔

گائے ـــــ ہندو گائے کا بول پیتے ہیں۔ مجوسی اُس سے مُنہ دھوتے ہیں۔ بدو اونٹ کے بول سے سر دھوتے ہیں۔

بشارت ـــــ (البشارہ) تحفہ جو خوشخبری لانے والے کو دیا جائے۔

مچھردانی ـــــ فارسی پشہ خانہ، عربی ناموسیہ: مصرِ قدیم میں دلدلی علاقے میں لگاتے تھے۔

لیلۃ الوفا ـــــ جس رات کو دریائے نیل میں زوروں پر طغیانی آجاتی تھی۔

تقرّری ـــــ سکھوں کے گورو کی تقرّری یوں ہوتی تھی کہ اُس کے سامنے پانچ پیسے اور ایک ناریل رکھ کر اُس کے ماتھے پر تلک لگا دیتے تھے۔

ککّے ـــــ گورو گوبند سنگھ نے ہر سکھ کو پانچ چیزیں پہننے کا حُکم دیا: کڑا، کیس، کرپان، کچھا، کنگھا۔

دیت ـــــ جرمانہ جو قاتل مقتول کے ورثا کو دے۔ عرب میں ایک سو اونٹ یا ایک ہزار دینار دیت ہوتی تھی۔

موت ـــــ کھٹمنڈو (نیپال) میں پشوپتی (شیو مہادیو) کا مندر ہے۔ لوگ اِس کے قریب بہتے ہوئے دریائے بگھمتی کے پانی میں پیر رکھ کر مرنے کی آرزو کرتے ہیں۔

خواجہ خضر ـــــ لوگ خواجہ خضر کے نام پر کاغذ کی کشتیاں دریا میں چھوڑتے ہیں۔ اِن میں دیئے جلا کر رکھتے ہیں۔

اِمامِ منتظر ـــــ شیعہ اِمامِ منتظر کے نام خط لکھ کر دریاؤں میں بہاتے ہیں۔